بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا

(القرآن)

رجسٹرڈ ایل نمبر ۶۰۴۵

ماہنامہ

معارف اسلام

نومبر ۱۹۵۶ء — جمادی الاول ۱۳۷۶ھ

نگرانِ اعلیٰ

(اعزازی)

علامہ سید امداد حسین کاظمی المشہدی

ناشر

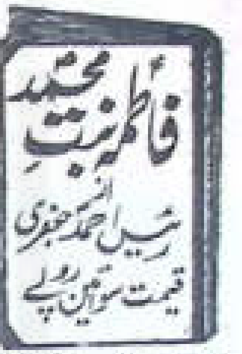
ادارہ معارفِ اسلام (رجسٹرڈ)

لاہور

چندہ سالانہ [illegible] — قیمت فی پرچہ ۸

[illegible]

اِن کا مطالعہ آپ کے تاریک پہلوؤں کو تابناک بنائیگا!



اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق محمدؐ و آل محمدؐ سے محبت کرنا اس کی رضا کا باعث ہے۔ محبت دو قسم کی ہوتی ہے: "زبانی" اور "عملی"۔ پہلی محبت اللہ کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ دوسری محبت اللہ کی رضا کا باعث ہے اور یہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ان کی زندگی کے حالات زیادہ سے زیادہ معلوم نہ کرلئے جائیں۔ اس لئے مومنین کیلئے بیحد ضروری ہے کہ ایسی کتابوں کا مطالعہ خود کریں، اپنے بچوں کو اس کا عادی بنائیں تاکہ ایسا ماحول پیدا ہوسکے جو محبت محمدؐ و آل محمدؐ کا عملی ثبوت دے سکے۔ "فاطمہ بنت محمدؐ" جو عربی زبان میں عمر ابو النصر نے لکھی اور جسے رئیس احمد جعفری نے اپنے فن کا انداز و رنگ میں پیش کیا ہے۔ نہایت ضروری ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے اور اسکے ساتھ کوشش کی جائے کہ ہماری خواتین سیدۂ عالم کے رنگ میں رنگ جائیں۔ اس لئے کہ قوم کے بننے اور سنورنے میں ان ہی کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔



علمی، مذہبی اور تاریخی حلقوں میں امیر المومنینؑ کے خطبات، توقیعات اور اقوال کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ ہر طالب اہمیت کیلئے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ خاص طور پر اس کتاب کا ترجمہ بھی ہے کہ تاریخی الجھنوں کا اس کتاب میں واضح حل موجود ہے جسے پڑھ لینے کے بعد ہر حقیقت کے متلاشی کو جو برسوں تلاش حق میں سرگرداں رہا ہو۔ یہ کتاب کا مطالعہ چشم زدن میں حقیقت سے ہمکنار کر دیتی ہے اور یہی اعجاز اس کتاب کی اس قدر اہمیت اور مقبولیت کا باعث بھی ہے۔



(سیرت امام حسین علیہ السلام نفسیاتی زاویۂ نگاہ سے)

امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ محض درد و الم اور سوز و گداز تک محدود رہا ہے۔ عہد حاضر کے انقلاب نے ہماری زندگی کے ہر پہلو کو شدید زخمی کر ڈالا ہے جس کے باعث ذہنی خلجان کے مریض شہادت حسین علیہ السلام کو بھی مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ مصنف نے اس کا اندازہ کرتے ہوئے واقعۂ شہادت کو نفسیاتی زاویۂ نگاہ سے روشنی ڈال کر نہ صرف شکوک کا ہی ازالہ کیا ہے۔ بلکہ اس عظیم شہادت کے مقصد و ماہیت سے بھی روشناس کرایا ہے۔

(ملنے کا پتہ)

شیخ غلام علی اینڈ سنز - پوسٹ بکس ۲۸۱ لاہور / بندر روڈ کراچی

"رستی و سستی بہترین سیاست است"

معارف اسلام

مدیر اعزازی: غیاث الدین

جلد ۴ | ماہ جمادی الاول ۱۳۷۸ھ مطابق نومبر ۱۹۵۸ء | شمارہ ۸

فہرست

ملت میں اتحاد اور دین اللہ کو پھیلانے کے لئے معارف اسلام کی مدد کیجیے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گفتنی ہا

وحدتِ ملّی کی برکتیں

گذشتہ شمارہ میں ہم نے اتحاد و تنظیم کے ضمن میں اپنا مافی الضمیر پیش کیا تھا۔ عنوانِ بالا کو بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی سمجھیے۔ سب سے پہلے اس بات کا دل میں اچھی طرح سے یقین کر لیجیے کہ آپ ایک ایسے مخصوص طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو سو فیصدی دینی ہے۔ سیاسیاتِ ملکی سے ہمیشہ کنارہ کش رہا ہے۔ اور ابھی تک محض اپنے دینی حقائق ہی کی وجہ سے قائم ہے۔ اگر آپ کا تعلق ملکی سیاستوں سے ہوتا اور جیسا کہ ہمیشہ سلاطین جو آپ کے خلاف رہے۔ اور اپنی دانست میں پوری طاقت سے آپ کا قلع قمع کرنے میں مصروف رہے۔ اقتدار ہمیشہ دوسری جماعتوں ہی کے ہاتھ میں رہا۔ آپ مدت سے مٹ چکے ہوتے جیسا کہ کئی فرقے مٹ گئے جن کے آج صرف نام ہی نام رہ گئے ہیں۔ لہذا آپ یہ چیز پوری طرح سے ذہن نشین کریں۔ کہ آپ کے کلہم معاملات پیدائش سے موت تک سو فیصدی دینی ہیں۔ پولٹیکل نہیں۔ اب آپ اپنے حالات اور خود اپنے نفسوں کا جائزہ لیں۔

ملک میں شاید ہی کوئی ایسا مقام ہو۔ جہاں آپ کی مختلف انجمنیں کام نہ کر رہی ہوں یعنی ایک ایک مقام پر کئی کئی انجمنیں موجود نہیں۔ نہ صرف ایک ایک شہر یا گاؤں میں بلکہ ایک ایک علاقے یا محلے میں کئی کئی انجمنیں تشکیل ہو چکی ہیں۔ اور انجمنوں کا یہ سیلاب دن بدن بڑھتا ہی جاتا ہے۔ کم نہیں ہوتا۔ اس پر طرّہ یہ کہ آپس میں بھی کھچاؤ رہتا ہے۔ ایک انجمن دوسری انجمن کے خلاف ہے۔ گو مذہبی یا دینی اختلاف معدوم ہے۔ مگر انجمن سازی کا شوق اور نمائندہ بننے کی ہوس ایک کو دوسرے کا مخالف بننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس امر سے انکار ناممکن ہے کہ اگر نیتیں بخیر ہوں۔ اور دل میں محبتِ دین و ایمان ہو تو آپس میں مخالفت محال بلکہ ناممکن ہو جاتی ہے۔ مگر حالات اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ افتراق قوم و مذہب کیلئے زہرِ قاتل سے کم نہیں اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو آپ کی طاقت دن بدن بٹتی جائے گی۔ اور آپ ایک مردہ جسم کی مانند ہو کر رہ جائیں گے۔

جس قوم کی تعداد صرف ایک ہی ملک میں کئی کروڑ ہو اور جس کا ہر سال کروڑہا روپیہ صرف

کارِ خیر ہی پر صرف ہو جاتا ہو۔ اُس کے روزنامہ اخبارات نہ ہوں۔ کوئی کالج یا مدرسہ نظر نہ آئے۔ باعث حیرت و تعجب ہے۔ مظلوموں کے نام لیوا ہونے کے باوجود اُس قوم کے ہسپتال اور خدمت خلق کے ادارے نہ ہونے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ اور روز بروز افراد قوم میں اختلافات اور علماء میں حسد و عداوت کا کیا باعث ہے؟ یہ چیزیں ہر ذی علم ہمدرد ملت کے سوچنے کے قابل ہیں۔ اس کی وجہ محض ایک اور صرف ایک ہی ہے۔ اور وہ ہے۔ قوم کا مختلف گروہوں مختلف انجمنوں، اداروں اور کانفرنسوں میں بٹ جانا۔ طاقت کے بٹ جانے سے جو جو کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ اظہر من الشمس ہیں۔ یہی اسوقت آپ کی ملت کا حال ہے۔ مرض اُسی وقت جگہ پکڑ لیتا ہے۔ جب کہ مریض کمزور ہو اور اگر مریض طاقت ور ہو تو مرض پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے اور مرض دب جاتا ہے۔ آج جس طرح ہمارا ایک خدا۔ ایک رسولؐ۔ ایک قرآن۔ ایک امام وقت ایک اصول ایک فروع ہے۔ اُسی طرح اگر ہماری قوم کا سربراہ بھی ایک اور تنظیم بھی ایک ہی ہوتی تو یہ امر ناقابلِ انکار اور حقیقت کے عین مطابق ہے۔ کہ سب دنیا آپ کی طرف کھنچی آتی اور کوئی طبقہ ایسا نہ ہوتا جو بعد از رسولؐ قرآن اور اہلبیت طاہرینؑ کے پیغام سے متاثر نہ ہو چکا ہوتا۔ اور آپ کے اصل دلائل و براہین سے مرعوب نہ ہو چکا ہوتا۔ مگر آج جب آپ کا نام کسی کے سامنے لیا جاتا ہے۔ تو فوراً بدعملی کی طرف اُس کے دماغ کا رجوع ہو جاتا ہے۔

قوم کا کروڑوں بلکہ اربوں روپیہ جو ہر سال غیر منظم طریقے سے بطور نذرانہ عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ اگر ایک تنظیم کے ماتحت صرف کیا جائے تو اُس سے اس قدر فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ جو ہمارے وہم و گمان سے بھی باہر ہیں۔ اور اسی صورت میں اس کے نذرانہ عقیدت ہونے اور قبولیت میں بھی کچھ شبہ نہ ہو گا۔ قوم کا شاید ہی کوئی فرد ایسا ہو جو کسی نہ کسی انجمن کا رکن نہ ہو۔ بلکہ اکثر آپ کو ایسے افراد ملیں گے۔ جو کئی کئی انجمنوں کے ممبر ہیں۔ اور باقاعدگی سے اُس انجمن کی مالی معاونت فرما رہے ہیں۔ اتنی انجمنوں کے الگ الگ کام کرنے سے کوئی ایک اہم کام بھی آج تک پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سب ادھورے پڑے ہیں۔ اگر آج تمام متفرق انجمنوں کے وجود کو ختم کر کے ایک واحد مرکزی انجمن قائم کر کے ہر فرد قوم اُس کے ساتھ وابستہ ہو جائے۔ ہر شہر و قصبہ و قریہ میں اُس مرکزی انجمن کی شاخ ہو۔ ہر فرد قوم کو اُس کا ممبر تصور کیا جائے اور ہر ایک کے لئے اُسی ایک انجمن کی اپنی اپنی مالی حیثیت کے مطابق ایک مقررہ معاونت کرنا ضروری قرار دیا جائے تو آج آپ کے اخبارات بھی جاری ہو سکتے ہیں۔ اور جگہ جگہ مدرسے بھی قائم ہو سکتے ہیں۔ اور آپ کے لئے کاروبار بھی مہیا ہو سکتے ہیں۔ اور آپ کے تبلیغی ادارے بھی چل سکتے ہیں۔ اور آپ کے اپنے ہسپتال بھی قائم ہو سکتے ہیں۔ اور آپ کی آواز بھی سُنی جا سکتی ہے۔ اور آپ کی بات کو توجہ سے

مطالبات کو بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ آپ کے بجٹ بھی بن سکتے آپ کے سیکرٹرایٹ بھی قائم ہو سکتے ہیں۔ اور آپ عزت و آبرو سے زندہ بھی رہ سکتے ہیں۔ اگر آپ کی واحد تنظیم قائم نہیں ہو سکتی تو آپ جدا جدا ہوتے جائیں گے آپ کی طاقت بٹتی چلی جائے گی۔ آپ ایک دوسرے سے دست وگریباں ہوتے رہیں گے۔ اغیار آپ پر ہنسیں گے اور آپ اور آپ کی آئندہ نسل آہستہ آہستہ اپنا دین و مذہب کھو کر اپنی دنیا اور آخرت کی خرابی کا باعث بن جائے گی۔

وما علینا الا البلاغ المبین!

معارف اسلام کے مسلک کی فتح

موجودہ حکومت سے پیشتر ملک میں جس طرح لوٹ کھسوٹ۔ چور بازاری اور غارت گری وغیرہ کا بازار گرم تھا، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ نیا دور جاری ہونے کے بعد امن پسند عوام نے سکھ کا سانس لیا امن کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ اور رعیت جو فتنہ وفساد میں مبتلا تھی۔ الیکشن کے لئے غلط پروپیگنڈے جاری تھے۔ سب ختم ہو گئے۔ جو لوگ اقتدار کے خواب دیکھ رہے تھے! در سادہ دل عوام کے جذبات سے کھیل رہے تھے، ان کے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ خدا نے ملک کو مصیبت سے بچا لیا۔ سابق صدر مملکت نے ملک میں موجودہ قوانین نافذ کرتے وقت یہ اعلان کیا تھا۔ کہ ”عام انتخابات سے ملک کی موجودہ صورتِ حال کی اصلاح نہیں ہو سکتی“ دیگر یہ بھی اعلان میں فرمایا کہ:

”سیاسی پارٹیوں کی ذہنیت ملک کے لئے وبالِ جان بن چکی ہے۔ ایسے حالات میں میرا خیال ہے کہ عام انتخابات سے صورتِ حال کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔۔۔۔ عام انتخابات میں وہی لوگ ہونگے جنہوں نے پاکستان کو تباہی کے گڑھے تک پہنچا دیا ہے۔ ظاہر ہے یہ لوگ انتخابات کو اپنی مقصد براری کے لئے استعمال کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ عام انتخابات علاقائی۔ طبقاتی اور ذات برادریوں کے اصول پر لڑے جائیں گے۔ جن کی وجہ سے جمہوریت ڈھونگ بن گئی ہے۔ اور جن کے باعث ملک میں سخت مایوسی پیدا ہو چکی ہے۔ نظم ونسق اچھا ہی کیوں نہ ہو، لیکن پارٹی بدلنے کی عادت اور برسرِ اقتدار آنے کی ہوس سے نہ تو انتخابات آزاد ہونگے۔ نہ ہی ان کی وجہ سے ملک کے بنیادی مسائل حل ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ایسے انتخابات ملک کی مایوسی اور رنج وغم میں اضافہ کرینگے۔۔۔“

یہ معارف اسلام کے مسلک کی بہت بڑی فتح ہے۔ کیونکہ ملکی حالات جو دن بدن بد سے بد تر ہو

ہے تھے۔ ان کی وجہ سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ گئی تھی۔ کہ جمہوریت کا نسخہ اس مریض کے لئے سخت مضر ہے۔ اور کسی وقت بھی جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔ رائے عامہ جو ناقص ہوتی ہے۔ اور عموماً بدلتی رہتی ہے۔ اپنے نفع و نقصان کو حقیقی طور سے نہیں سمجھ سکتی۔ بلکہ اپنے ہر جائز و ناجائز مفاد کے حصول کے لئے اپنی ذاتی خواہش اور ذاتی رائے پر عمل کر گذرتی ہے چاہے بعد کو اُسے نقصان ہی کیوں نہ اُٹھانا پڑے۔ لہٰذا یہ خلافِ دینِ اللہ ہے۔ ہمارے ہر فعل و قول اور نیت تک کا خداتم کی مرضی کے ماتحت ہونا ضروری ہے۔ اسلامی اصولوں کے تحت ہماری اپنی ذاتی رائے کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ "قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ" (قرآن) اور معیارِ قیادت "إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ" (قرآن) کی رو سے خوفِ خدا۔ عمل صالح اور قابلیت ہے۔ نہ کہ عوام کے ووٹ جن میں بد بھی ہوتے ہیں اور جاہل بھی۔ لہٰذا موجودہ دنیا کے فسق و فجور اور بدامنی عالم کا واحد علاج یہی ہے۔ کہ تمام دنیا میں جمہوریت کو دفن کر کے معیاریت کو رائج کیا جائے۔ خداوندِ عالم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ انتظامِ حکومت بر وقت فوج کے سپرد ہو جانے سے ملکِ پاکستان ایک بڑے خطرے سے بچ گیا اور مرکزی حکومت بھی قابلیت اور نیک نیتی کے لحاظ سے معیاری آدمیوں سے تشکیل دی گئی ہے۔ جب ہر سرکاری دفتر میں ڈیوٹی کے لئے قابلیت اور تجربہ کے معیار کے مطابق افراد لئے جاتے ہیں تو محکموں کے چوٹی کے سربراہ اپنے اپنے کاموں کے بہترین دماغ کیوں نہ ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ ملک صحیح راستہ پر چل نکلا۔

کتاب "استقرارِ حقِ عزاداری"

عزاداری امام حسین علیہ السلام عہدِ حضرت ختمی مرتبت (صلعم) سے جاری ہے۔ آپ فرمائیں گے کہ شہادتِ عظمیٰ تو سنہ ۶۱ ہجری میں واقع ہوئی۔ عہدِ رسولؐ میں عزاداری کیسے جاری ہو گئی؟ اس کا جواب یہی ہے۔ کہ قیامت۔ یوم محشر۔ جنت و دوزخ تو ابھی آئندہ آنے ہیں۔ یہ پہلے ہی اِن کے متعلق بیانات کیسے اور ڈر و خوف کیسا؟ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح جنت و دوزخ وغیرہ کے متعلق حضرت مخبرِ صادق (صلعم) نے بیانات دیئے اُسی طرح واقعۂ کربلا کے متعلق بھی مسلمانوں کو آگاہ فرمایا۔ واقعات بیان کر کے خود روئے اور اہلبیتؑ۔ امہات المومنینؓ اور صحابہؓ کو رلایا۔ قرآن میں اِس واقعۂ عظمیٰ کی خبر نہ صرف عہدِ رسولؐ میں دی گئی۔ بلکہ عہدِ حضرت ابراہیم خلیل اللہ میں بھی آگاہ کیا گیا۔ اور اس کے لئے

"ذبحِ عظیم" کا لفظ ارشاد فرمایا۔ قولِ اقبال علیہ الرحمۃ سے

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر ؎ معنیٔ "ذبحِ عظیم" آمد پسر

اور تاریخوں سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ بھی واقعہ شہادت سن کر گریہ وزاری فرماتے رہے۔ [1]

غرضیکہ یہ عزاداری قدیم الایام سے جاری ہے۔ اور تمام مسلمانان اہل تشیع حضرات صوفیاء اور اہلسنت والجماعت وغیرہ وغیرہ اپنے اپنے طریقوں سے عزاداری مناتے ہیں۔ مگر ایک مسلمہ امر ہونے کے باوجود چند در چند یہ مسئلہ متنازعہ رہا۔ یہ محض اس لئے کہ چونکہ یہ واقعہ بنی امیہ کے عہد میں ہوا تھا اور حکومت ۱۳۲ھ تک بنی امیہ کے ہاتھوں میں رہی۔ لہٰذا عزاداری الاعلان نہ منائی جا سکی۔ یہ بات چل نکلی اور بعض حالات کی وجہ سے ابھی تک مختلف طریقوں کے متعلق بحث جاری ہے۔

آپس میں بے اتفاقی مسلمانوں کے لئے سخت نقصان دہ اور بربادی کا باعث ہے۔ عزاداری امام مظلوم چونکہ سب مناتے ہیں۔ لہٰذا سب مسلمانوں کے لئے یہ مرکزِ اتحاد کا درجہ رکھتی ہے۔ اس امر کے لئے آپ کے اس محبوب ادارہ (معارفِ اسلام) نے کتاب مستطاب "استقرارِ حقِ عزاداری" تیار کی ہے۔ جسے عزاداری امام حسین علیہ السلام کا قاموس سمجھ لیجیے۔ اس ضمن جس چیز کی بھی آپ کو ضرورت ہو گی۔ آپ کو کتاب میں مل جائے گی۔ یہ مسئلہ عزاداری امام مظلوم کے متعلق یہ ایک تاریخی دستاویز ہے۔ جو اپنے موضوع میں کامل و اکمل ہے۔ جس کی مثل گذشتہ تیرہ ۱۳ سو سال میں موجود نہیں۔

کتاب کو ایک ہی جلد میں تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ حصہ اول "مقدمہ استقرارِ حق" ہے۔ جس میں مسئلہ عزاداری پہ ایک جامع تبصرہ ہے۔ جو اپنے پہلو میں بیسیوں مضامین لئے ہوئے ہے۔ یہ دنیا کی مختلف حکومتوں کے مذہبی آزادی کے اعلانات ہیں۔ جن سے ہر فرقہ کی اپنے مذہبی اعمال کی انجام دہی میں مکمل آزادی شامل ہے۔ اگر اسی حصہ کو بغور مطالعہ کر لیا جائے تو تمام تنازعات کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ حصہ دوم "دعوئے استقرارِ حق" کے نام سے موسوم ہے۔ جس میں مختلف تنقیحات قائم کر کے سب سے پہلے اسلام کے دو مایہ ناز فرقوں شیعہ و سنی کے متعلق مکمل حالات درج ہیں لغت قرآن۔ تفاسیر۔ احادیث اور تواریخ سے مدلل کی گئی ہے۔ ہر دو ۲ فرقوں کی

[1] پڑھیے جناب ابوالحسنات سید محمد احمد صاحب (صدر جمعیت العلماء پاکستان) کی مشہور و معروف کتاب "اوراقِ غم" و دیگر کتب تاریخ و سیر وغیرہ وغیرہ۔

تاریخ متحدہ ہندوستان میں ترویج مذہب اہلبیتؑ کی تاریخ۔ تاریخ عزاداری۔ تاریخ کربلا معلیٰ۔ تاریخ کوفہ۔ مختصر تاریخ واقعات کربلا۔ جدول حالات حضرت سید الشہداء علیہ السلام تاریخ مجالس عزا۔ تاریخ جلوس محرم۔ تاریخ تعزیہ۔ تاریخ شبیہ ذوالجناح اور کئی دیگر مفید مضامین شامل ہیں۔ تیسرا حصہ "جواز عزاداری" ہے۔ جو اپنی نوعیت میں لاثانی حیثیت کا حامل ہے۔ جملہ افعال عزاداری کا از روئے قرآن۔ بطریق سنی اور بطریق شیعہ از روئے کتب اہل کتاب علیحدہ علیحدہ باب قائم کر کے متعلقہ کتب کے مکمل حوالہ جات سے مزین کیا گیا ہے۔ عزاداری امام حسین علیہ السلام میں جو افعال انجام دیئے جاتے ہیں۔ ہر ہر عمل کا علیحدہ علیحدہ جواز ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جو رہ گیا ہو۔ فضائل گریہ و انعقاد مجالس کے علیحدہ ابواب ہیں۔ ذاکرین و مرثیہ خوانوں کے متعلق علیحدہ ابواب قائم کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد پاک و ہند میں مختلف مقدمات عزاداری کے مکمل متن اور ججوں کے فیصلے مع تاریخ و نمبر مقدمہ وغیرہ مکمل تفصیلات سے درج کئے گئے ہیں۔ انگریزی متن بھی دیئے گئے ہیں۔ عزاداری پر بیسیوں اعتراضات کے مکمل جوابات کا علیحدہ باب قائم کیا گیا ہے۔ کتب شیعہ سے عزاداری کے خلاف جو مواد پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا مکمل جواب بھی پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کیا ہے۔ عزاء امام مظلوم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے متعلق مکمل مضامین کا ایک بے بہا خزانہ ہے۔ جس کا ہر ذی علم ہر مولوی۔ ہر قانون دان۔ ہر لائبریری اور ہر گھر میں ہونا ضروری ہے مگر اس عظیم الشان کتاب کی اشاعت کا بار ادارہ معارف اسلام فی الحال اکیلا برداشت کرنے کے قابل نہیں۔ لہٰذا یہ اسکیم بنائی گئی ہے۔ کہ اس کے خریدار پیشگی بنا لئے جائیں۔ اور جس وقت کم از کم چار صد خریداروں کی طرف سے پیشگی رقم موصول ہو جائے تو کتابت شروع کرا دی جائے۔ ڈیڑھ ہزار بڑے صفحوں کی کتاب قیمت بارہ ۱۲ روپے ہو گی اور مجلد و لائتی پندرہ ۱۵ روپے کی ہو گی۔ لہٰذا ذی علم و مخیر حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ اس امر عظیم کی طرف فوری توجہ فرمائیں۔ اگر کوئی محب امام حسین علیہ السلام عطیہ دینا چاہے تو عطیہ جات کی رقم کی وجہ سے قیمت کتاب مزید کم کر دی جائے گی۔

ہم بخوبی سمجھتے ہیں۔ کہ اگر کوئی ایک ہی عاشق حضور سید الشہداء میدان عمل میں آ جائے تو یہ کتاب فوری طور پر زیور طبع سے آراستہ ہو سکتی ہے لہٰذا ہم تمام مومنین کی خدمت میں یہ دردمندانہ آواز پہنچانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ دیکھیں کون کون دربار حسینی میں اپنا نام لکھواتا ہے۔ رقوم کی آمد کا حساب علیحدہ رکھا جائے گا۔ رسیدات باقاعدہ ارسال کی جائیں گی۔ (ادارہ)

برائیوں کی جڑ !

کیا آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے۔ کہ دنیا میں برائیوں کی جڑ کیا ہے؟ دنیا میں سب ہی قسم کے لوگ آباد ہیں۔ سینکڑوں عقائد اور ہزاروں اصول لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ پھر طبیعتیں جدا جدا ماحول جدا جدا۔ رسم و رواج جدا جدا ہیں۔ کوئی بات ایک جگہ پسند کی جاتی ہے۔ دوسری جگہ وہی بات ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔ دنیا میں زیادہ تر خدا پرست آباد ہیں۔ اور اپنے اپنے ادیان و مذاہب کی رو سے خدا پرستی کرتے ہیں۔ لاکھوں ادارے اور ہزاروں انجمنیں زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق صحیح راستہ دکھانے کے لئے برسرِ کار ہیں۔ ہزاروں کالج اور سینکڑوں یونیورسٹیاں انسانوں کو علم سکھانے میں مصروف ہیں۔ مگر باوجود ان تمام کوششوں کے دنیا دن بدن فسق و فجور میں مبتلا ہو رہی ہے۔ ظلم و ستم میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ برائیاں روز بروز بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں۔

اسلام اگر دین کامل ہے اور یہی سچا مذہب ہے۔ تو چاہیئے مسلمانوں ہی میں برائیوں کا فقدان ہوتا اور امن و اطمینان قائم ہوتا مگر یہاں تو عملی طور پر زیادہ ہی قابلِ اعتراض باتیں ظاہر ہوتی ہیں جو دوسروں کیلئے قابلِ تقلید نہیں۔ اگر مسلمانوں ہی میں علم زیادہ ہوتا تو تمام دنیا ان ہی کی یونیورسٹیوں سے علم حاصل کرتی مگر مسلمان یورپ و امریکہ کے تعلیمی اداروں میں جا کر ان کے مرہونِ منت ہوتے ہیں بلکہ کئی تحریکات مسلمانوں میں پیدا ہو چکی ہیں جن کی رو سے یورپی تعلیمات سے متاثر ہو کر ایسے خیالات و نظریات کو اسلام میں دھکیلا جا رہا ہے۔ اگر یورپی نظریات ہی کو درست تسلیم کر لیا جائے تو وہاں ہی امن و اطمینان ہوتا۔ مگر حالات ایسے نہیں۔ کہ بقول کسی گذشتہ پاپائے روم کے اقبال کی زبان سے ؎

کند ہر قوم پیدا مرگ خود را
ترا تقدیر و ما را گشت تدبیر

تو پھر تمام دنیا سے برائیاں ختم کیوں نہیں ہوتیں؟ ہماری تحقیق کے مطابق اس کی ایک اور صرف ایک ہی وجہ ہے۔ وہ یہ کہ "خدا اور آخرت پر لوگوں کو یقین نہیں ہے۔" اور "آخرت کا یقین بھی" خدا پر یقین کے ماتحت ہی آتا ہے۔ خدا ہماری نظروں کے سامنے نہیں یعنی ہم اپنی بصارت سے اسے نہیں دیکھ سکتے۔ وہ کوئی مادی شے نہیں۔ بلکہ وہ جب روحانی شے بھی نہیں تو مادی کیونکہ ہوگا۔ لہذا خدا بھی مادیت سے پوشیدہ اور آخرت بھی۔ جب آخرت کو بھی محض ایک واہمہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ اور سب کچھ مادیت یا جسم انسانی یا اصلی

(بقیہ صفحہ ۲۳ پر ملاحظہ ہو)

حکمران اور رعیت کے باہمی حقوق

(بزبان امیر المومنین علیہ الصلوٰۃ والسلام)

"...... وأعظم ما افترض سبحانه من تلك الحقوق حق الوالي على الرعية وحق الرعية على الوالي، فريضة فرضها الله سبحانه لكل على كل، فجعلها نظاماً لألفتهم وعزاً لدينهم. فليست تصلح الرعية إلا بصلاح الولاة، ولا تصلح الولاة إلا باستقامة الرعية. فإذا أدت الرعية إلى الوالي حقه، وأدى الوالي إليها حقها، عز الحق بينهم، وقامت مناهج الدين، واعتدلت معالم العدل، وجرت على أذلالها السنن، فصلح بذلك الزمان، وطمع في بقاء الدولة، ويئست مطامع الأعداء. وإذا غلبت الرعية واليها، أو أجحف الوالي برعيته، اختلفت هنالك الكلمة، وظهرت معالم الجور، وكثر الإدغال في الدين، وتركت محاج السنن، فعمل بالهوى، وعطلت الأحكام، وكثرت علل النفوس، فلا يستوحش لعظيم حق عطل، ولا لعظيم باطل فعل، فهنالك تذل الأبرار، وتعز الأشرار، وتعظم تبعات الله عند العباد. فعليكم بالتناصح في ذلك وحسن التعاون عليه، ......" (نہج البلاغہ)

"...... اور سب سے بڑا حق کہ جسے اللہ سبحانہٗ نے واجب کیا ہے حکمران کا رعیت پر اور رعیت کا حکمران پر ہے، کہ جسے اللہ نے والی و رعیت میں سے ہر ایک کے لئے فریضہ بنا کر عاید کیا ہے اور اسے ان میں رابطۂ محبت قائم کرنے اور ان کے دین کو سرفرازی بخشنے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ رعیت اسی وقت خوشحال رہ سکتی ہے جب حاکم کے طور طریقے درست ہوں اور حاکم بھی اسی وقت صلاح و درستگی سے آراستہ ہو سکتا ہے جب رعیت اس کے احکام کی انجام دہی کیلئے آمادہ ہو۔ جب رعیت، فرمانروا کے حقوق پورے کرے اور فرمانروا رعیت کے حقوق سے عہدہ برآ ہو تو ان میں حق باوقار، دین کی راہیں استوار اور عدل و انصاف کے نشانات برقرار ہو جائینگے اور پیغمبر کی سنتیں اپنے ڈھرے پر چل نکلیں گی اور زمانہ سدھر جائیگا۔ بقائے سلطنت کے توقعات پیدا ہو جائینگے اور دشمنوں کی حرص و طمع ناامیدی سے بدل جائیگی اور جب رعیت حاکم پر مسلط ہو جائے یا حاکم رعیت پر ظلم ڈھانے لگے تو اس موقعہ پر ہر بات میں اختلاف ہوگا، ظلم کے نشانات ابھر آئیں گے، دین میں مفسدے بڑھ جائیں گے، شریعت کی راہیں متروک ہو جائینگی، خواہشوں پر عمل درآمد ہوگا، شریعت کے احکام ٹھکرا دیئے جائیں گے، نفسانی بیماریاں بڑھ جائیں گی اور بڑے سے بڑے حق کو ٹھکرا دینے اور بڑے سے بڑے باطل پر عمل پیرا ہونے سے بھی کوئی نہیں گھبرائیگا۔ ایسے موقعہ پر نیکوکار ذلیل اور بدکردار باعزت ہو جاتے ہیں اور بندوں پر اللہ کی عقوبتیں بڑھ جاتی ہیں۔ لہٰذا اس حق کی ادائیگی میں ایک دوسرے کو

سمجھانا بجھانا اور ایک دوسرے سے خوبی تعاون کرنا تمہارے لئے ضروری ہے ......"

(از الحاج آقائے سید لطیف شاہ صاحب گنہاوی)

حقائق و معارف

تیرا ہی ذکرِ خیر ہو دل اور زباں کے ساتھ (۱) دونوں یہ ہمنوا ہیں ترے بیاں کے ساتھ
میں گلستانِ دہر میں بے آشیاں رہا (۲) بجلی کو دشمنی تھی مرے آشیاں کے ساتھ
محرم ملا نہ کوئی مجھے اس جہان میں ۳ سرخوش رہا میں ذکرِ دلِ رازداں کے ساتھ
تسبیحِ دل وظیفۂ اہلِ ذکر ہے! (۴) کچھ رابطہ نہیں اسے مادّی جہاں کے ساتھ
قدرت کے راز - آدم و شیطاں میں دشمنی (۵) شر کا مقابلہ بشرِ ناتواں کے ساتھ
یک بے نیاز دستہ سرگرمِ عیش و نوش (۶) بے برگ ساز تودہ آہ و فغاں کے ساتھ
وابستگی جاہلاں با مسندِ امور (۷) راز و نیازِ کاملاں پیرِ مغاں کے ساتھ
تسخیر و ضبطِ نفس سراسر محال ہے (۸) بے لطفِ حق کہ شرط ہے اہلِ اماں کے ساتھ
حسنِ عمل ہے مقصدِ تکوینِ زندگی (۹) ذوقِ سفر ہے لازمہ ہر کارواں کے ساتھ
بے نورِ اہلِ بیت بسر کر نہ زندگی (۱۰) یہ چودھویں کے چاند ہیں مرکز رساں کے ساتھ
کیا جانے غیر لذتِ سوز و فغانِ عشق (۱۱) اس کا تو مشغلہ ہے شکم اور دہاں کے ساتھ
وعدہ کیا تھا خواب میں آئے نہیں ابھی (۱۲) دل بیقرار چشم بھی اشکِ رواں کے ساتھ
زیبا نہیں یہ تلخ نوائی دلا تجھے (۱۳) آ سیکھ تو مثالِ شاہدِ شیریں بیاں کے ساتھ
ٹھہر اے اجل - شتاب نہ کر جیتے ہیں ابھی (۱۴) کچھ مختصر سا کام ہے صاحب قراں کے ساتھ
تیار ہیں منتظر ترے باغِ بہشت میں (۱۵) غلمان و حور وعدۂ اہلِ جناں کے ساتھ

یادداشت } مندرجہ بالا نظم جو قبلہ شاہ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں ہمیں دی ہے نہ صرف فصیح و لطیف و شیریں بلکہ حقائق و معارف سے لبریز ہے۔ اشعار ۱-۳-۴-۱۳ میں ایسے کنایات ہیں جن کی تہ کو اہلِ ریاضت و معرفت ہی پہنچ سکتے ہیں۔ شعر ۹ میں اشارہ ہے۔ بہ آیۂ کریمہ الذی خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا۔ (قرآن جز ۲۹) شعر ۱۰ ذو معنی ہے۔ اولاً محمد و آلِ محمد چہاردہ معصومین ہیں۔ ثانیاً یہی چہاردہ (۱۴) معصومین خود چودھویں کے چاند یعنی بدرِ کامل ہیں جو قیامت تک اس دنیا میں چمکتے رہیں گے۔ دوسرے مصرعہ میں مرکز کا لفظ خود ذو معنی ہے۔ (۱) مرکزِ عالمِ امکانیہ یعنی محمد مصطفےٰ۔ (۲) مرکزِ حقیقی یعنی خدا تعالےٰ۔ کوئی شخص پیغمبرِ اسلام تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا جب تک اہلبیتِ نبوت کا دامن نہ پکڑے۔ جب پیغمبر کے حضور میں پہنچیگا تو پیغمبر کے ذریعے خدا اقدس کے حضور میں پہنچ سکیگا۔ شعر ۱۴ میں اشارہ ہے بطرف ظہورِ حضرت ۳

۳ حضرت امام زمان عجل اللہ فرجہ صاحب زمان ہیں اور صاحب قرآن بھی یعنی قرآنِ ناطق (ادارہ)

وحدتِ ملی کے متعلق نامہ و پیام

محترم سردار کریم بخش حیدری
و
غیاث الدین مدیر ادارہ "معارف اسلام"

(یادداشت) بہ "معارف اسلام" کے شمارہ ماہ اکتوبر میں "گفتنی ہا" کی ابتداء میں "تنظیم و قیادت کے سلسلہ میں چند غور طلب نکتے" بیان کئے گئے تھے۔ اس ضمن میں ہمارے محترم سردار کریم بخش صاحب حیدری نے علی پور سے اپنے خیالات کی "وضاحت" ارسال فرمائی ہے، جس کے متعلق مدیر "معارف اسلام" نے بھی اپنا مافی الضمیر واضح کیا ہے۔ ذیل میں اول محترم سردار صاحب کی "وضاحت" بعد ازاں مدیر "معارف اسلام" کا جواب درج کیا گیا ہے۔ (ادارہ)

وضاحت!

(از سردار کریم بخش حیدری علی پور)

برادرِ ایمانی! تسلیم! "معارف اسلام" ماہ اکتوبر ۱۹۵۶ء میں تنظیم و قیادت کے سلسلہ میں ادارہ کا نوٹ پڑھ کر بڑی روحانی مسرت ہوئی ہے۔ کہ آپ نے رفیق محترم سید حسن بلتانی اور اس ناچیز کے مضامین پر تنقید و تبصرہ فرما کر ہماری عزت افزائی فرمائی ہے۔ اور اپنے قیمتی خیالات کا اظہار کر کے اس مسئلہ کی طرف قوم کی بھی توجہ مبذول کر دی ہے۔ ہم ادارہ "معارف اسلام" کی اس ذرہ نوازی اور علم دوستی کے ممنون ہیں۔

خدا کا شکر ہے۔ کہ بنیادی امور میں ہمارے اور ادارہ کے نقطۂ نظر میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ بعض گوشے جو ابھی تک بظاہر اختلافی معلوم ہوتے ہیں۔ انشاء اللہ مزید افہام و تفہیم سے ان میں بھی یکجہتی پیدا ہو جائے گی۔ اور اس دوستانہ بحث میں قوم کو بھی غور و فکر کا موقعہ مل جائے گا۔

ہمارا مقصد یہ ہے۔ کہ ہماری تنظیم ہو۔ ہم میں وحدت اور مرکزیت قائم ہو جائے۔ کیونکہ اس کے بغیر تنظیم ناممکن ہے۔ ہمارا دینی نظام۔ وحدت اور مرکزیت کا علمبردار ہے۔ ایک خدا۔ ایک رسولؐ۔ ایک قرآن بیک وقت ایک امام ایک شریعت۔ ایک قبلہ۔ ایک اصول۔ ایک فروع اور ایک طرح کے احکام اسلام پر ہمارے دینی مسلک کا دار و مدار ہے۔ اور یہی آئمہ معصومین علیہم السلام کی تعلیم ہے۔ خدا وحدہٗ لاشریک ہے۔ رسولِ خدا آخری پیغامبر ہیں۔ ان کے مقابلہ میں کوئی دوسرا رسول نہیں

قرآن کی موجودگی میں کوئی دوسرا الہامی اور غیر الہامی حکم قابلِ عمل نہیں۔ رسالت کے بعد امامت کا سلسلہ بلا فصل ہے۔ اور ایک وقت میں ایک امام مرجع خلائق۔ محافظِ دین اور ناشر و مبلغ قرآن و سنت ہے۔ امام حسنؑ کے زمانہ میں حضرت حسینؑ موجود ہیں۔ لیکن نائبِ امام بھی نہیں کہلا سکتے۔ اسی طرح حجتِ عصر علیہ السلام کے زمانہ "غیبت صغریٰ" میں بیک وقت ایک سفیرِ امام مقرر کیا جاتا ہے۔ جو ہمارا مفتی اعظم۔ مجتہدِ اعظم اور اعالم ہے۔ اس کے علاوہ جس قدر عالمِ دین اور مجتہد اس زمانہ کے موجود ہیں کسی کو نائبِ امام یا مجتہدِ اعظم کہلانے کا مستحق قرار نہیں دیا گیا۔

اب غیبتِ کبریٰ کے اس پُر آشوب عبوری دور میں ہماری روحانی قیادت اور سیادت اور نائبِ امام اور مجتہدِ اعظم کے منصبِ جلیلہ کیلئے ہم کس طرح یہ تسلیم کریں کہ ہر صاحبِ تقلید مجتہد نائبِ امام ہے۔ اور آیۃ اللہ فی العالمین کے لقب سے ملقب کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت میں اس موجودہ انتشار اور تشتت کی تمام تر ذمہ داری اس گھر گھر اجتہاد اور کثیر التعداد مجتہدین پر عائد ہوتی ہے۔ جنہوں نے خود کو پیرو مرشد بنا کر قوم کے حصے بخرے کر دیئے ہیں۔ اور فقہی اختلاف یا اجتہادی اختلاف کی آڑ لے کر قوم کی وحدت اور مرکزیت ختم ہو رہی ہے۔ ایرانی، عراقی کو مجتہدِ اعظم تسلیم نہیں کرتے اور عراقیوں کا نائبِ امام جدا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ عالمی شیعی تنظیم قائم نہیں رہ سکی۔ اور اس کا یہ اثر ہوا ہے کہ تمام اسلامی ممالک جس میں پاکستان بھی شامل ہے۔ مجتہدین حضرات کے الگ الگ گروہ، پارٹیاں فتوے۔ فیصلے اور ٹولے بن گئے ہیں جس سے قوم کا شیرازہ منتشر ہو کر رہ گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ امام حسن عسکری علیہ السلام اور حضرت حجت عصر علیہ السلام کے ارشادات غیبت کبریٰ کے لئے عمومی حیثیت کے مالک ہیں۔ لیکن جب ہزاروں مجتہدین کو چھوڑ کر اب ملت نے دو عالمی مجتہدین عظام کو سب سے بڑا جس طرح سے مان لیا ہے۔ اسی طرح سے ان دو میں سے ہی ایک کو بڑا تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ تاکہ ہمارا ایک مفتی اعظم۔ مجتہدِ اعظم اور نائبِ امام بن کر سربراہِ قوم اور سردار و قائدِ ملت کہلانے کا صحیح معنوں میں مستحق قرار دیا جا سکے۔ ان کے وجود سے "وحدت و مرکزیت" قائم رہے۔ اور یہی "ادارہ اجتہاد" کا صدر نشین اور ناظمِ اعلیٰ بن کر رہے۔ اور شیعی دنیا میں ایک ہی قسم کی فقہ کا "دستور العمل" رائج ہو سکے۔ موجودہ فقہی اختلافات ختم ہو جائیں جس کی رو سے جمعہ، جماعت اور خمس و زکواۃ اور دیگر شرعی امور میں کھچتی جاتی رہی ہے۔

بیشک ہمارے ہاں "معصوم" کی حد تک انتخاب ناجائز ہے۔ لیکن غیر معصومین میں سے ELECTION کی بجائے SELECTION یعنی انتخاب اور قابلیت اور اہلیت کے معیار پر کسی کو بڑا چن لینا تو نام نہاد جمہوریت سے مماثلت قرار نہیں دی جا سکتی۔ نماز جماعت کے لئے چند پیشنمازوں میں سے آخر ایک کو ہر لحاظ سے دوسروں سے بہتر سمجھ کر چن لینا کبھی جمہوری

اور انتخابی زد میں نہیں آسکتا۔
اسی طرح سے عالم اسلامی کے شیعہ مجتہدین اور علمائے کرام کسی مقام پر جمع ہو کر ایک مفتی اعظم اور مجتہد اعظم کی ذات پر اظہار اعتماد کر کے اس کو شیعی دنیا کا قائد اور مذہبی پیشوا تسلیم کر لیں اور فقط یہی ایک ذات "نائب امام" کہلانے کی مستحق سمجھی جائے تو یہ کیونکر جمہوریت بن جائے گی۔؟
تاریخی لحاظ سے ماضی میں ہمارا سب سے بڑا عالم دین بیک وقت تمام شیعی دنیا کا مجتہد اعظم رہ چکا ہے۔ سرکار مرزا۔ آقائے اصفہانی۔ مفید علیہ رحمہ۔ جامع نہج البلاغۃ کے والد ماجد وغیرہم۔ آخر موجودہ دستور کے مطابق مجتہدین میں بھی اعلم کی تقلید کا جو حکم دیا گیا ہے۔ اس میں باقی مجتہدین کی تقلید ساقط ہو کر رہ گئی ہے۔ اسی طرح دو مجتہد عظام میں یا چند اعالم میں سے ایک کو سب سے بڑا مجتہد تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ جو آپ کے مسلک کے مطابق SELECTION ہو گا۔ نہ کہ ELECTION
میں نے اس نظام کو ادارہ اجتہاد کہہ کر اس کے فضل و کرم اور فیوض و برکات کو بطور ایک INSTITUTION. کا جو اقرار کیا ہے۔ وہ مسئلہ اجتہاد کے لئے ہر طرح سے موزوں ہے۔
یہی ادارہ اجتہاد ہے جو دین کو ساکن اور جامعہ ہونے سے بچا کر ہر زمانہ کی دینی ضروریات کا "نباض" قرار دیا گیا ہے۔ قانون سازی ہمارے ہاں اسطرح سے جاری ہے۔ کہ دین کے بنیادی اور اصولی تصورات کی روشنی میں ہمارا مجتہد اعظم حالات اور ضروریات زمانہ کے مطابق آئمہ معصومین علیہم السلام کے ارشادات کی روشنی میں (BY LAWS) ضمنی قواعد مرتب کرکے اور یہ کام دین کو زندہ اور پائندہ رکھنے اور ہر زمانہ میں شیعی دنیا کی مکمل رہنمائی اور قیادت کیلئے ضروری ہے۔ دینی مسائل کے علاوہ امام کے ارشاد سے دوسرے "مسائل حیات" میں بھی "مجتہد اعظم" کو رہنمائی کا مجاز قرار دیا گیا ہے۔ اور آج "مجتہد اعظم" نہ ہونے کی وجہ سے فقہی اختلافات کے علاوہ دوسرے مسائل زندگی میں ہماری رہنمائی جس طرح ساقط ہو کر رہ گئی ہے وہ ایک ایسی المناک داستان ہے۔ جو آپ بہتر جانتے ہیں۔
ہمارے بھائیوں نے "اجتہاد" کو "آئمہ اربعہ" تک محدود بنا کر غیر مقلدین اور وہابیت کو جنم دے دیا ہے۔ اور آئمہ اربعہ کے باہمی فقہی اختلافات سے جو مکتب خیال الگ الگ ہو گئے ہیں۔ ہمارے ہاں ان "اجتہادی غلطیوں" کا سدباب اسی طرح سے ہو سکتا ہے۔ کہ ہر زمانہ میں شیعی دنیا کا ایک مجتہد اعظم ہو اور وہی ہمارا مذہبی پیشوا۔ سربراہ قوم۔ سردار ملت اور نائب امام" ہو کر دینی وحدت اور قومی مرکزیت کو قائم کر کے ہماری تنظیم کر سکتا ہے جس کی تفصیلات اور لائحہ عمل میں نے اپنے مضامین میں بیان کر دیا ہے۔
ان معروضات کو معارف اسلام کے قیمتی صفحات میں شائع فرما کر مشکور فرمائیں۔ والسلام

(جواب صفحہ ۱۲ پر ملاحظہ فرمائیں)

"معارف اسلام":- مکرم و محترم حیدری صاحب السلام علیکم!

"وحدت ملی" یا "مرکزیت قومی" کے متعلق تو اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کا ارشاد بجا اور درست کہ "موجودہ انتشار و تشتت کی تمام ذمہ داری اس کثرت اجتہاد اور کثیر التعداد مجتہدین پر عاید ہوتی ہے"۔ معارف اسلام (اکتوبر ۱۹۵۵ء) میں بھی اسی بات پر زور دیا گیا تھا۔ کہ ہماری کمزوری کا باعث علما، لیڈران قوم اور انجمنوں کی بہتات ہے۔ افتراق بہتات ہی کی وجہ سے ہے۔ لہٰذا کثرت سے کنارہ کشی اختیار کرکے ہمیں وحدت کی طرف جھکنا پڑیگا۔ اور عالم یا لیڈر صرف وہی کہلانے کا مستحق ہوگا جو مضمون کے فرمودہ معیار پر پورا اترے۔ چند چیزیں قابل غور ضرور ہیں:-

(۱) اس میں شک نہیں۔ کہ بعض فقہی مسائل میں مجتہدین کے فتاوے میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس اختلاف کو دور ہونا چاہیئے۔ مگر آپ کو اس بات سے بھی اتفاق ہوگا۔ کہ موجودہ قومی انتشار اور جملہ کمزوریاں محض فقہی مسائل ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی وجہ کچھ اور ہے اور آپنے درست سمجھی ہے۔ یعنی عدم مرکزیت یا فقدان وحدت ملی بحمداللہ کہ ہمارے فقہی مسائل میں بہ نسبت دوسروں کے بہت کم اختلافات ہیں اور ہر جگہ ماسوائے چند ایک مخصوص مسائل کے ایک ہی طریقہ پر عمل ہو رہا ہے۔ اگر آج امام وقت کی غیبت میں ہماری مرکزیت قائم ہو جائے۔ تو ہمارے تمام دکھوں کا علاج ہو جائے۔ مگر سوچنا تو یہ ہے۔ کہ کیا ہمارے مذہبی اصولوں کی رو سے یہ مرکزیت قائم بھی ہو سکتی ہے۔؟

(۲) اگر مجتہد اعظم کو مرکز تسلیم کر لیا جائے تو کیا اصولی طور پر یہ درست ہے۔ کہ مجتہد اعظم ہمیشہ عربی، عراقی یا ایرانی یا مستقل طور پر کسی ایک مخصوص ملک ہی کا باشندہ ہو کیا ہند یا پاکستان یا کسی دوسرے ملک میں اس معیار کا مخصوص فرد کبھی پیدا نہیں ہوا یا آئندہ نہیں ہو سکتا؟ مثلاً حضرت غفران مآب و حضرت فردوس مآب طاب ثراہ یا ناصر الملت اعلی اللہ مقامہ وغیرہ ایسے علما مقدس بزرگ دنیا کے جملہ مومنین کے مجتہد اعظم کہلائے جانے کے مستحق تھے یا نہیں۔ موجودہ میں حضرت آقائے سید حسین بروجردی و آقائے سید محسن حکیم طباطبائی ہر دو بزرگوار ان کا علم ... کرتے ہیں۔ اور ان حضرات کا علم اور عزت و تکریم شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ لہٰذا یہی مرکزیت مقام پر فائز ہیں۔ مگر مقصد تو یہ ہے۔ کہ اصولی طور پر کیا پاکستان یا کسی دوسرے ملک میں بھی کوئی ایسا فرد نہیں ہو سکتا جو تمام دنیا کے محبان علیؑ کا لیڈر یا مجتہد اعظم کہلا سکے اور تمام ممالک کے مومنین بھی اسے تسلیم کریں۔ یہ قابل غور چیزیں ہیں۔

(۳) موجودہ صورت میں آقائے بروجردی مدظلہ العالی (مجتہد اعظم) نے پاکستان میں اپنا آقائے شریعتی مدظلہ کو مقرر فرمایا ہوا ہے۔ آقائے موصوف کے عالم شرع اور باعمل و نیک طینت

ہونے میں کچھ شبہ نہیں مگر کیا ملک پاکستان میں کوئی ایسا عالم موجود نہیں جسے مجتہد اعظم اپنا نائب بنا سکتے۔ کیا پاکستان میں آقائے شریعتی مدظلہ سے زیادہ مقدس اور زیادہ علمیت والا کوئی فرد موجود نہیں۔ کیا اصولی طور پر ہر ملک میں وہیں کا بہترین آدمی چھانٹ کر نائب مجتہد اعظم نہیں بن سکتا جو زیادہ مفید اور زیادہ با عمل مرکزیت قائم کی جائے۔ تو ان امور کی طرف مجتہد اعظم کو توجہ دلانا ضروری ہوگا۔ اگر مجتہدِ اعظم کو اختیارات کلی حاصل ہیں۔ تو مرکزیت قائم ہے۔ مومنین پاکستان کو ہر امر میں آقائے شریعتی مدظلہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

(۴) سب سے بڑھ کر اہم ترین مسئلہ یہ ہے۔ کہ مرکزیت صرف پاکستان ہی سے وابستہ نہیں۔ بلکہ ہند و چین عرب و مصر اور دیگر تمام ممالک کے مسلمان اہلبیت سے وابستہ ہے۔ اگر صرف عراق ایران اور پاکستان ہی کا معاملہ ہوتا تو آسانی سے طے ہو سکتا تھا۔ مگر وحدت ملی صرف اسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے جب کہ تمام دنیا کا نظام اس کے ماتحت چلے۔ لہذا اس اہم معاملہ کو تمام ممالک کی طرف سے اٹھنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں اگر پاکستان ہی کو آگے قدم بڑھانا ہے۔ (کیونکہ یہ آواز جہاں تک ملی ضرورات کا تعلق ہے۔ صرف پاکستان ہی سے آرہی ہے۔ اور دوسرے ممالک خاموش بیٹھے ہیں) تو سب سے پہلے خود مجتہدین عظام سے رابطہ قائم کر کے ان سے شرعی اجازت اس امر عظیم کے متعلق لی جائے اور پھر دیگر ممالک کے علمائے کرام سے نامہ و پیام کر کے ان کو جاندار مرکزیت قائم کرنے کے لئے آمادہ کیا جاوے۔ یا پہلے دیگر ممالک سے خط و کتابت کی جائے۔ بعد ازاں مجتہدین عظام سے بصورت وفد تمام مل کر یا تحریراً بات چیت کریں۔

(۵) اگر مرکزیت کے قیام سے آپ صرف فقہی مسائل ہی کا حل چاہتے ہیں۔ تو وہ مرکزیت تو پیشتر ہی قائم ہے۔ البتہ آپ مومنین کو آمادہ کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ کہ وہ صرف مجتہدِ اعظم ہی کی تقلید کریں۔ اور کسی کی نہ کریں۔ مگر اس صورت میں تو قومی تشتت و افتراق ختم نہ ہو سکے گا۔ (اور ہی موجودہ صورت میں ختم ہے۔) کیونکہ اس صورت میں ہر ایک ذاتی طور پر اسی مجتہد اعظم کے فتویٰ کے تحت اپنا عمل تو قائم کر لیگا۔ مگر دیگر تمام قومی و مجلسی و دیگر معاملات میں پارٹی بازی جاری رہیگی لہذا مرکزیت کا قیام اس صورت میں مفید ہو سکتا ہے۔ جبکہ فقہ کے علاوہ دیگر تمام معاملات اسی مرکزیت کے ماتحت سرانجام ہوں۔ ہماری تمام زندگی شروع سے آخر تک صرف مذہب ہی سے وابستہ ہے۔ لہذا زندگی کا ہر شعبہ اسی مرکزیت کے زیر اثر ہونا چاہیے۔

اس ضمن میں یہ چیز خاص طور پر توجہ طلب ہے۔ کہ چونکہ سوائے امام اور کوئی معصوم نہیں اور پیروی بلا چون و چرا صرف معصوم ہی کی ہو سکتی ہے۔ نیز مجتہدین عظام اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے۔ بلکہ قرآن و حدیث اور تشریحات معصومین سے استنباط کرتے ہیں۔ لہذا کیا ہر فیصلہ

بحث و مذاکرہ کے بعد کیا جائے گا؟ یا مجتہد اعظم کو اختیارِ کلی حاصل ہوگا۔ یا مجتہد اعظم کا صرف وہی فیصلہ قابلِ تسلیم ہوگا جس کو وہ قرآن و حدیث اور اقوالِ معصومینؑ سے مطابقت کے ساتھ جاری کرے؟ بہر حال مجتہدین عظام کو اس بات پر آمادہ کیا جائے۔ کہ وہ سر جوڑ کر بیٹھ جائیں اور تمام دنیا کے مومنین کے مسائل کا قال اللہ و قال الرسولؐ و آئمہ طاہرینؑ کی روشنی میں مستقل حل تلاش کریں۔ تاکہ اس پر عمل شروع کیا جائے۔ اس میں کیا یہ امر قابلِ غور نہیں کہ ملت کے موجودہ حالات کا جو دکھ آپ کو یا آپ جیسے دوسرے ہمدردانِ ملت کو ہو رہا ہے۔ کیا مجتہدین عظام کو یہ فکر لاحق نہیں اور بحیثیت سربراہِ قوم یا اپنی بلند پوزیشن کے یہ درد وہ محسوس نہیں کر رہے۔ کہ قوم کیونکر منظم ہو اور موجودہ خلفشار سے آزاد ہو سکے؟ میرے خیال میں خود ان کے دل میں یہ درد ضرور ہوگا۔ مگر اپنے زہد و تقدس کی وجہ سے وہ یہ بات ظاہر نہیں فرما رہے۔ مبادہ اُن پر اپنی سرداری قائم رکھنے کا الزام عائد ہو جائے۔ لہٰذا ہمیں خود ہی ان کی طرف قدم بڑھا کر انہیں آمادہ کرنا پڑے گا۔ تاکہ ان کے لئے کھل کر اس امرِ خیر میں حصہ لینے کا موقع پیدا کیا جائے۔ نیز یہ دیکھنا بھی ضروری ہے۔ کہ ہم آج ہی تو پیدا نہیں ہوئے صدیوں سے موجود ہیں۔ اور غیبتِ کبریٰ کے بعد بھی صدیاں گزر گئیں گذشتہ ایام میں ملت کا کیا طریقہ رہا۔ کہ جس پر عمل کیا جاتا رہا؟ بہر حال اس معاملہ کو اب موجودہ حالت سے آگے بڑھانے کے لئے کیا یہ بہتر نہ رہے گا۔ کہ سب سے پہلے اس تحریک کے داعیان کا ایک مشترکہ وفد یہاں کے چیدہ چیدہ علمائے کرام کی خدمت میں جا کر اس معاملہ کو اٹھائے اور اس امر کو دیگر ممالک تک پہنچا کر سب علمائے دین کو آمادہ کیا جائے اور پھر تمام دنیا کے محبانِ اہلبیتؑ کا ایک مرکزی اجتماع مناسب ملک میں مناسب مقام پر منعقد کرنے کے لئے کوشش کی جائے۔ والسلام

خادم:-

غیاث الدین (مدیر ادارہ معارفِ اسلام)

معارفِ اسلام قومی پریس فنڈ

فی زمانہ کسی قوم کا پریس کے بغیر زندہ رہنا محال ہے۔ قوم کے لئے پریس ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہے۔ ہمارا کوئی روزنامہ نہیں۔ ہماری کتب احادیث و تفاسیر وغیرہ نایاب ہیں۔ ہم اپنی آواز دوسروں کے کانوں تک نہیں پہنچا سکتے ہم انتشار و پارٹی بازی کا شکار ہو رہے ہیں۔ وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہمارا قومی پریس اور ہمارا قومی روزنامہ ہے اگر آپ با آبرو زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ تو معارفِ اسلام قومی پریس فنڈ میں دل کھول کر اضافہ کریں۔ اس فنڈ کی تمام قوم مالک ہے۔ عطیات کم یا زیادہ براہ راست حبیب بنک لمیٹڈ شاہ عالمی گیٹ لاہور کو معارفِ اسلام پریس فنڈ میں یا ادارہ کو براہ راست ارسال فرما دیں۔ (ادارہ معارفِ اسلام)

از:- علامہ سید ابوالحسن [illegible]

ثقل اکبر و ثقل اصغر

سلسلہ کیلئے دیکھو معارف اسلام بابت ماہ جون ۱۹۶۸ء

سابقاً حدیث ثقلین یعنی قرآن اور اہلبیتؑ کی تشریح میں بتایا گیا ہے۔ کہ ثقلین "تثنیہ" کا صیغہ ہے جس سے دو ثقل مراد ہیں۔ یعنی ثقل اکبر اور ثقل اصغر۔ جب رسالت پناہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے فرمان واجب الاذعان سے یہ معلوم ہو گیا۔ کہ ثقلین کا انحصار صرف قرآن اور اہلبیتؑ میں ہی ہے۔ تو اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ ان دونوں میں سے ثقل اکبر کون ہے۔ اور ثقل اصغر کون؟

اس میں کچھ شک و شبہ نہیں۔ کہ آنحضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے بعض احادیث میں قرآن مجید کو ثقل اکبر بھی فرمایا ہے۔ اور اہلبیت علیہم الصلوٰۃ والسلام کو ثقل اصغر۔ لیکن اس سے نعوذ باللہ یہ مراد نہیں۔ کہ درجہ اور رتبہ میں اہلبیت عظام قرآن مجید سے کمتر ہیں۔ کیونکہ اگر قرآن مجید ثقل اکبر مانا جائے۔ تو اسے اہلبیت علیہم السلام سے افضل ماننا پڑے گا۔ لیکن اگر الفضل للمتقدمین کو پیش نظر رکھا جائے۔ کہ مقدم کو متاخر پر فضیلت حاصل ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا ارشاد گرامی اول ما خلق اللہ نوری اور انا و علی من نور واحد بھی ملحوظ خاطر رہے جس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ آنحضرت صلعم اور آپ کے اہلبیت طاہرین سے پہلے کوئی مخلوق ہی نہیں ہوا تو قرآن کسی صورت میں بھی اہلبیتؑ سے افضل نہ ٹھہرے گا۔ لہٰذا ثقل اکبر بایں معنی نہ ہو گا نیز جب یہ تسلیم کر لیا گیا۔ کہ اہلبیتؑ کا وجود اول مخلوق ہے۔ اور قرآن بھی مخلوق ہے۔ تو لامحالہ اہلبیتؑ کی خلقت قرآن سے بھی پہلے ہوگی۔ کیونکہ اگر قرآن کو آپ کی خلقت سے پہلے مانا جائے۔ تو آپ کے اول مخلوق ہونے کا کچھ مطلب ہی نہیں رہ جاتا۔ پس اس لحاظ سے بھی اہلبیت ہی افضل ٹھہریں گے۔ اور وہی ثقل اکبر ہوں گے بجہت افضلیت۔

پس آنحضرت صلعم کے اس فرمان کی تاویل کی جائے گی۔ جو یوں ہوگی۔ کہ چونکہ قرآن ان کا شاہد ہے۔ اور یہ مشہود اور شاہد مشہود سے مقدم ہوتا ہے۔ یا یہ کہ قرآن ظاہر بظاہر ہر وقت ہر زمانہ میں ہر شخص کے پاس موجود رہے گا۔ لہٰذا اس میں مجموعی حیثیت سے ظاہر طور پر اکبر ہونے کی ایک صفت پائی جائے گی۔ اور چونکہ اہلبیت علیہم السلام ظاہر بظاہر ہر گھر میں موجود نہ پائے جائیں گے۔ اس لئے اس جہت سے انہیں ثقل اصغر سے تعبیر کیا گیا۔

لیکن حدیث ثقلین میں ان دونوں کی تعریف میں لن یفترقا ارشاد فرمایا گیا ہے جس میں لن نفی ابدی ہے۔ کہ ان دونوں یعنی قرآن اور اہلبیتؑ میں ابد تک جدائی اور افتراق نہیں ہوگا۔ اور یہاں لن کا اطلاق اسی طرح ہے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لن ترانی کہہ کر رویت باری تعالیٰ کی تا ابدی نفی کی گئی تھی۔ پس جس طرح قرآن کا وجود تا ابد موجود رہیگا۔ اسی طرح اہلبیتؑ کا وجود بھی تا ابد موجود رہے گا۔ پس یہ ثقل اکبر ٹھہرینگے۔ اور قرآن ثقل اکبر بایں معنیٰ ٹھیرے گا۔ کہ وہ ظاہر بظاہر ہر گھر میں موجود ہے۔ بلکہ ہر قاری کے پاس موجود ہے۔ لیکن اہلبیتؑ ظاہر بظاہر موجود نہیں ہیں۔ حتیٰ کہ اہلبیتؑ کی بارھویں فرد اس وقت پردۂ غیبت میں مستور ہے لیکن اس سے ثقل اکبر اور ثقل اصغر یعنی اہلبیتؑ اور قرآن کے باہمی اتحاد سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہ اتحاد اس وقت تک قائم رہے گا۔ حتیٰ کہ دونوں آنحضرت صلعم کے پاس حوضِ کوثر پر پہنچ جائیں۔ اس کے حتمی ثبوت کے لیئے اتنا ہی کافی ہے۔ کہ واقعہ کربلا میں اہلبیتؑ کی ایک فرد خاص حسینؑ کا سر بدن سے جدا کر دیا گیا۔ بدن ریگ کربلا پر پڑا ہوا تھا۔ اور سر نوکِ نیزہ پر سوار تھا۔ لیکن سر دمشق اور کوفہ کے بازاروں میں تلاوتِ قرآن مجید باآواز بلند کر رہا تھا۔ اور دنیا والوں کو بتا رہا تھا۔ کہ دیکھو میرے نانا رسولؐ کا قول غلط نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ میرا سر میرے بدن سے کاٹ کر نوکِ نیزہ پر سوار کرا دیا گیا ہے۔ لیکن لن یفترقا کی رو سے اب بھی قرآن مجھ سے جدا نہیں ہوا۔

ثابت ہوا۔ کہ آنحضور صلعم کا کسی وقت قرآن کو ثقل اکبر اور اہلبیتؑ کو ثقل اصغر سے تعبیر فرمانا فرق مراتب کی وجہ سے نہ تھا۔ بلکہ ان کے ظاہر اور باطن ہونے کی جہت سے تھا۔

اس میں ایک باریک نکتہ بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ حدیث ثقلین میں دونوں فردوں کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے۔ اول کتاب اللہ۔ دوم عترتی اہلبیتی۔ یعنی قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ نسبت دی ہے۔ اور اہلبیتؑ کو آنحضور صلعم کے ساتھ۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کو اکبر سے نسبت دی جاتی ہے۔ مثلاً اذان میں اللہ اکبر اس لئے قرآن جو اللہ تعالیٰ سے منسوب ہے۔ اسے ثقل اکبر کہا گیا۔ یعنی ثقلین کا ایک جزو جو "اکبر" سے منسوب ہے۔ اور آنحضور صلعم سے منسوب جزو اہلبیتؑ کو اصغر کہا گیا۔ چونکہ قرآن مجید کو علماً من علوم محمدؐ و آل محمدؐ کہا گیا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں اسے قول رسولؐ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ کما قال تعالیٰ۔ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ (پ ۲۹ حاقہ ع ۲۔ پ ۳۰ تکویر ع ۱)

اصل بات یہ ہے۔ کہ یہ مصدر ہیں رحمت الہیہ کے۔ چنانچہ آپ کو وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (پ ۱۷ الانبیاء ع ۷) میں "رحمت" فرمایا گیا۔ "رحمت" مصدر ہے۔ اور اہل علم جانتے ہیں۔ کہ مصدر کا مفہوم کچھ نہیں ہوا کرتا جب تک کہ اپنے فاعل سے نہ ملے۔ مثلاً اردو زبان میں آنا، جانا، کھانا، سب مصدر ہیں۔ لیکن مجہول۔ اسی طرح عربی زبان میں "رحمت" مصدر ہے "رحمٰن"

ہم وابل ہے۔ پس "رحمت" کا مفہوم تبھی معروف ہوگا جب کہ اپنے قابل سے ملے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی "رحمۃ للعالمین" کے فعل کو اپنے افعال کہا۔ مثلاً قول رسولؐ کے متعلق ارشاد ہوا۔

وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحیٰ (پ۲۷ النجم ع)

ترجمہ:۔ ہمارا رسولؐ اپنی خواہش سے نطق نہیں فرماتا۔ مگر یہ کہ وہ سب میری وحی ہی ہوتا ہے۔

فعل رسولؐ کے متعلق فرمایا۔ وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ (پ۹ انفال ع) اے رسولؐ جو کنکریاں آپ نے پھینکی تھیں۔ وہ دراصل آپ نے نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ ہی نے پھینکی تھیں۔ اسی طرح بیعت کے متعلق ارشاد ہے۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ ط یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ (پ۲۶ فتح ع)

ترجمہ:۔ اے رسولؐ حقیقت میں جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں۔ وہ تو اللہ تعالیٰ ہی سے بیعت کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ ہی کا ہاتھ ہوتا ہے۔

چونکہ اہلبیت عظام مصدر تھے۔ الوار الٰہیہ کے۔ اس لئے ذات خدا کا کلام ان کی زبان سے جاری کیا گیا۔ اسی لئے یہ لسان اللہ کہلائے۔ چنانچہ ان کا اپنا قول شاہد ہے کہ نحن لسان اللہ الناطق فی خلقہ کہ ہم خداوند تعالیٰ کی بولتی ہوئی زبانیں ہیں۔ اس کی مخلوق میں۔ چونکہ کلام کے لئے صوت یعنی آواز۔ حرکت اور مخرج کا ہونا لازمی ہے۔ جو محل حوادث ہیں۔ اس لئے ان کو اہلبیتؑ سے کہلوایا گیا۔ ورنہ اللہ تعالیٰ حادث ٹھہرتا۔ جو منافی توحید ذات باری تعالیٰ ہے۔

صوت یعنی آواز کے لئے حرکت لازم ہے۔ اور قاعدہ فلسفی کی رو سے ہر شے میں حرکت پائی جاتی ہے۔ لیکن اگر نور اول یا مخلوق اول میں بھی حرکت ہوگی۔ تو خرابی لازم آئے گی۔ اور وہ یہ کہ حرکت کی تعریف شائین کے نزدیک قوت سے فعلیت کی طرف آنے کا نام ہے۔ اور اشراقین کے نزدیک نقص سے کمال کی طرف آنے کو کہتے ہیں۔

اگر نور اول میں حرکت ہوگی۔ تو ماننا پڑے گا۔ کہ نور اول میں نقص تھا۔ جو غلط ہے کیونکہ نور اقنیہ ہے اور مسلم حکما ہے۔ کہ اول مخلوق کو ہر حیثیت سے کامل ہونا چاہیئے۔ پس ماننا پڑے گا۔ کہ نور اول میں سکون ہی سکون ہے۔

سکون دراصل بقا کا نام ہے۔ کیونکہ حرکت میں تغیر لازم ہے اور تغیر کے لئے فنا لازم ہے۔ اور سکون کیلئے فنا لازم نہیں کیونکہ وہاں حرکت نہیں۔

ارشاد ہے۔ وما امرنا الا واحدۃ (پ۲۷ قمر ع) یعنی نہیں ہمارا امر مگر ایک یعنی ہمارے امر میں تغیر نہیں ہوتا۔ جب امر میں تغیر نہیں تو اولی الامر یعنی صاحبان امر میں تغیر کیوں کر ہو سکتا ہے۔

غور کریں آپ ۔ مخلوقات کی دو قسمیں ہیں :-

(۱) مخلوقاتِ امری

(۲) مخلوقاتِ خلقی

مخلوقاتِ خلقی کے متعلق ارشاد ہے۔ اوّل خلق نعیدہ، (پ۱۷ الانبیا ع۷) اوّل مخلوق کو ہم پھر لوٹا دینگے۔ معلوم ہوا۔ کہ اس مخلوق میں جس کے لئے لفظ خلق آیا ہے۔ یعنی مخلوق خلقی اس میں حرکت ہے۔ بس یہی مخلوق فنا ہوگی۔ لہٰذا جو مخلوق خلقی کے مصداق ہیں وہ فنا ہوں گے۔ لیکن جو مخلوق امری سے متعلق ہیں۔ وہ فنا نہیں ہوں گے۔

چنانچہ ارشاد ہے۔ ونفخ فی الصور فصعق من فی السماوات ومن فی الارض الا من شاء اللہ (پ۲۴ زمر ع۷) کہ جب صور پھونکا جائے گا۔ تو جو بھی آسمانوں میں ہیں۔ اور جو بھی زمینوں میں ہیں وہ مر کر گر پڑیں گے۔ سوائے ان (وجود مقدسہ مخلوق امری) کے جن کو اللہ تعالیٰ چاہے گا۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے۔ ویوم ینفخ فی الصور ففزع من فی السماوات ومن فی الارض الا من شاء اللہ۔ (پ۲۰ النمل ع۷) یعنی جس دن صور پھونکا جائے گا۔ تو جو آسمانوں اور زمینوں میں ہے۔ وہ سب دہل جائیں گے۔ سوائے ان کے جن کو اللہ تعالیٰ چاہے گا۔

ان ہر دو آیات میں لفظ "من" آیا ہے۔ جو ذوی العقول کے لئے بولا جاتا ہے۔ پس یہ مخلوق امری ہوں گے۔ جو فنا نہیں ہوں گے۔ صور پھونکا رہے گا۔ لیکن ان پر اثر انداز نہ ہوگا اور وہ فنا نہیں ہوں گے۔

اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس کلام کا۔ کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام۔ (پ۲۷ الرحمٰن ع۲) یعنی جو کچھ زمین کے اوپر ہے وہ فنا ہو گا لیکن اللہ تعالیٰ کا بزرگی والا چہرہ فنا نہیں ہو گا۔ اگر اس آیہ مجیدہ میں اللہ تعالیٰ کے چہرہ سے خدا کا اپنا چہرہ مراد لیں۔ تو چہرہ کے لئے باقی بدن کا وجود بھی ماننا پڑے گا۔ گویا اللہ تعالیٰ کا چہرہ تو باقی رہے گا۔ لیکن خدا کے جسم کے باقی اعضاء فنا ہوں گے اور خدا کے اعضاء اور جسم کو مان کر توحید کہاں جائے گی؟

لیکن آیت بتاتی ہے۔ کہ کوئی وجود بزرگی اور کرامت والا ایسا ضرور ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے اپنا چہرہ قرار دیا ہے۔ جس طرح ان کی زبان لسان اللہ۔ جس طرح ان کا نطق وحی اللہ جس طرح ان کا ہاتھ یداللہ اسی طرح ان کا وجود وجہ اللہ کہلاتا ہے۔ اور وہی وجود مقدسہ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ کہ جب صور پھونکا جائے گا۔ تو ہر شخص فنا ہو جائے گا۔ سوائے ان کے جن کو خداوند تعالیٰ باقی رکھنا چاہے گا۔ یہ کون ہیں؟

وجہ ربک ذوالجلال والاکرام ۵ (الایہ) یعنی جن کی صفت ہے۔ کرم اللہ وجہہ۔ اور یہی مخلوق امری۔ مخلوق خلقی "مخلوق" کہلائیں گے۔ اور مخلوق امری "مامور"

پس جب پتہ چل گیا۔ کہ ان کے ہاں حرکت نہیں اور اول مخلوق ہونے کی جہت سے محتاجِ محل نہیں۔ تو ان کے لئے سکون ہی سکون ہوگی۔ جب سکون ہے تو ان کا مقام کہاں ہو سکتا ہے۔؟

سابقاً تفصیل کے ساتھ کہا جا چکا ہے۔ کہ ہر شے اپنے مرکز کی طرف رجوع کرتی ہے۔ آپ ایک ڈھیلا اوپر کی طرف پھینکئے۔ جب ہاتھ کی حرکت کا زور ختم ہوگا۔ ڈھیلا زمین یعنی اپنے مرکز کی طرف لوٹے گا۔ مشک میں ہوا بھر کر پانی کے اندر چھوڑ دیجئے۔ فوراً سطحِ آب پر آجائے گی۔ کیونکہ اس کے اندر ہوا ہے۔ اور ہوا کا مرکز سطحِ آب سے اوپر ہے۔ و قس علیٰ ذالک رسولؐ اور اہلبیتؑ کا مقام اور مرکز عرش معلیٰ تھا۔ جب تک دستِ قدرت کا دباؤ رہا۔ زمین پر قائم رہے۔ جب قدرت نے چاہا۔ دباؤ اٹھا لیا۔ کہاں پہنچا؟ اپنے مرکز عرش پر۔ عرش وہ مقام جہاں لاکھوں برس تسبیح کرتا رہا تھا۔ لہذا رسولؐ کا معراج پر جانا کوئی مشکل امر نہیں۔ اس کی تفصیل انشاءاللہ تعالیٰ کسی اور اشاعت میں معراج کے موضوع پر کی جائے گی۔

لیکن جیسا کہ اوپر ثابت کیا جا چکا ہے۔ جب اس مخلوق امری میں حرکت نہیں۔ سکون ہی سکون ہے۔ تو ان کا مقام کہیں نہیں ہو سکتا۔ پس عرش ان کا مقام کیسے ہوگا؟ پھر آنحضرت صلعم نے کیوں انہیں ثقلین سے تعبیر فرمایا؟

اب ذرا پھر ثقلِ اکبر ثقلِ اصغر کی طرف آیئے۔ اگر قرآن مجید کو ثقلِ اکبر مانا جائے۔ تو وہ افضل ہوگا اہلبیتؑ سے۔ لیکن بوجہ اول مخلوق ہونے کے اہلبیتؑ قرآن سے ہر لحاظ افضل ہیں۔ جیسا کہ اوپر تشریح کی گئی۔ اگر اہلبیتؑ ثقلِ اکبر ہوں گے۔ تو افضل ہوں گے۔ اور چونکہ اہلبیتؑ اول مخلوق ہیں۔ پس قرآن اس وقت مخلوق نہ تھا۔ لہذا اہلبیتؑ قرآن کی خلقت سے قبل مخلوق ہونے کی جہت سے قرآن مجید کی خلقت اصلیہ سے جاہل تھے۔ جب جاہل تھے۔ تو ناقص تھے۔ جب ناقص تھے۔ تو افضل نہ ہوں گے۔ جب افضل نہ ہوں گے۔ تو ثقلِ اکبر بھی نہ ہوں گے۔ پس دونوں میں مساوات ثابت۔

لیکن مساوات بھی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ ارشادِ رسولؐ ہے۔ اول ما خلق اللہ نوری لہذا افضل ہونا چاہیئے۔ اور جب افضل ہوں گے۔ تو اکبر بھی ہوں گے۔ پس مساوات باطل۔

جب مساوات باطل تو اتحاد ثابت۔

پس جو قرآن ہے۔ وہ اہلبیتؑ ہیں۔ اور جو اہلبیتؑ ہیں۔ وہ قرآن ہے۔ حقیقتِ قرآن

حقیقتِ اہلبیتؑ ہے۔ اور حقیقتِ اہلبیتؑ حقیقتِ قرآن ہے۔

"اوّل ما خلق اللہ نوری" میں اہلبیتؑ اور قرآن شامل ہیں۔ قرآن میں حضرت یوسفؑ اور دیگر انبیاءؑ کیلئے ارشاد ہے۔ وفوق کل ذی علمٍ علیم (پ۱۳ یوسف ع۲)
— انا نبشرک بغلامٍ علیم (پ۱۴ حجر ع۴) — وبشروہ بغلامٍ علیم (پ۲۶ ذاریات ع۲)

یعنی "انبیاء علیم ہوتے ہیں۔ علیم صفت مشبہ ہے۔ اس لئے ذاتِ انبیاء سے مختص ہے جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ انبیاء علیہم السلام پیدائشی طور پر عالم ہوتے ہیں۔ جب دیگر انبیاء ذاتی طور پر پیدائشی عالم ہیں۔ تو نورِ اوّل بدرجہ اولیٰ عالم ہوگا۔ اور نورِ اوّل میں اہلبیتؑ بھی داخل ہیں۔ انا و علیؑ من نورٍ واحد۔

پڑھو الرحمٰن ۔ علّم القرآن ۔ خلق الانسان ۔ علّمہ البیان ۔ (پ۲۷ الرحمٰن ع۱)
یعنی اللہ تعالیٰ نے علمِ قرآن دیا۔ پھر ایک خاص کامل صفت انسان کو پیدا کیا۔ پھر اُسے اس قرآن کا بیان کرنا سکھلایا۔ معلوم ہوا تعلیمِ قرآن پہلے ہے۔ اور خلقت بعد میں۔ پھر خلقت کے بعد قرآن کے بیان کی تعلیم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلعم جب جبرئیلؑ آیاتِ قرآن لے کر نازل ہوتے تھے۔ قرآن کے بولنے سے پہلے ہی آپ ان آیات کی تلاوت فرما دیا کرتے تھے۔ جس پر آپ کو روک دیا گیا۔ اور ارشاد ہوا۔

لاتحرک بہ لسانک لتعجل بہ ۔ ان علینا جمعہ وقراٰنہ ۔ فاذا قراٰنہ فاتبع قراٰنہ ۔ ثم ان علینا بیانہ (پ۲۹ قیامۃ)

ترجمہ :- اے رسول اللہ صلعم آپ وحی کے ساتھ ہی اپنی زبان کو اس غرض سے حرکت نہ دو۔ کہ اسے جلدی ادا کرلو۔ تحقیق اس کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔ پھر جب ہم اسے پڑھا دیں۔ تو تم اس کے پڑھنے کی پیروی کرو۔ پھر یقیناً اس کا بیان کرنا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے۔ کہ جب قرآن حقیقتِ اہلبیتؑ کے ساتھ ہے۔ تو پھر ما بین الدفتین کیا شے ہے؟ اہلبیتؑ اٹھ گئے تو قرآن بھی اٹھ جانا چاہیئے تھا۔

اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اہلبیتؑ کی ایک فرد ہمیشہ موجود رہی ہے۔ اور اب بھی موجود ہے اور قرآن مع اپنے مطالبِ حقیقیہ کے اس کے پاس موجود ہے۔ یہ وہی نورِ اوّل تھا۔ جسے مختلف لباس پہنائے گئے۔ کبھی لباسِ نور۔ کبھی لباسِ وجود۔ کبھی لباسِ الفاظ۔ کبھی لباسِ نبوّت۔ اور کبھی لباسِ امامت۔

پھر دونوں کو ثقلین کیوں کہا؟
قرآن کو ثقیل کہا۔ رسولؐ آئندہ زمانہ کی خبر دے رہا ہے۔ کہ لوگ اس کے مطالبِ حقیقیہ کو

چھوڑ کر اس کے معانی اپنی خواہشات کے مطابق کریں گے۔ یعنی مطالب قرآنیہ مرکز سے ہٹادیئے جائیں گے اہلبیت قرآن اور قرآن ہی کے نزدیک تقلیل پیدا ہو جائے گا۔

اہلبیتؑ کا مرکز خلافتِ الٰہیہ تھی۔ عوام کے نزدیک اہلبیتؑ خلافتِ الٰہیہ سے ہٹا دیئے گئے۔ جب مرکز سے ہٹ جائیں گے۔ تو تقلیل پیدا ہو جائے گا۔ خلافت کا مرکز الٰہیہ تھا سیاسی نہ تھا۔ اس لئے تقلیل پیدا ہو گیا۔ (سید امداد حسین کاظمی)

(صفحہ ۳ کا بقیہ)
زندگی ہی کو سمجھ لیا جائے اور عمل کا تعلق دنیا تک ہی محدود ہو۔ تو اپنی مرضی کے فائدوں کے لئے جو کچھ بھی آپ کر گزریں سب کچھ روا ہو گیا۔ جب آپ کو موت کے وقت کا علم نہیں اور بازپرس کا بھی یقین نہیں تو مرتے دم تک دولت سمیٹتے جائیے۔ اپنے ذاتی جسمانی مفاد میں سرگرداں رہیئے۔ مگر جب آپ کا صحیح معنوں میں خدا پر یقین ہو گا۔ اور اپنی آخرت یعنی حیات بعد از موت آپ کو بصیرت میں سمائی ہو گی تو ناممکن ہے کہ آپ سے کوئی غلط قدم اُٹھے۔ حاکم اُسے دیکھتا ہو تو چور چوری نہیں کرتا۔ اگر اس بات کا یقین ہو جائے کہ ہمارا ہر عمل کسی کی نگاہوں میں ہے۔ اور کوئی وقت ایسا بھی آنے والا ہے۔ کہ وہ ہستی اِن اعمال کا محاسبہ کر کے سزا قبول کرنے پر ہمیں مجبور کر دے گی۔ تو غلط قدم کیونکر اُٹھے گا۔ یہی آئمہ معصومینؑ کی تعلیمات میں ہے۔ اصول دین میں "توحید و عدل" کا مطلب ہی یہی ہے۔ آپ کہیں گے کہ تمام دنیا میں اس اہم تعلیم کو کیونکر پھیلایا جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ آپ صرف خود ہی اس یقین پر کاربند ہو جائیں آپ خود مطمئن ہو جائیں گے۔ آپ کی زندگی امن و چین میں پڑ جائے گی۔ اور پھر جوں جوں کسی کے ساتھ واسطہ پڑے گا۔ یہ سلسلہ بڑھتا رہے گا۔ (ادارہ)

(بقیہ صفحہ ۱۴)
خدا اور قسم کا ہو گا۔ اور بعد بخت نصر کا اور قسم کا بنی اسرائیل کے دور شوکت و سطوت کا خدا اور قسم کا ہو گا۔ اور زوال و انحطاط بیت المقدس کی بربادی اور اس کے بعد مسیحی قوموں کے زمانہ کا خدا اور قسم کا۔

وعلیٰ ھذا القیاس۔

جواد حسین عفی عنہٗ

(باقی آئندہ)

ممبران ادارہ و خریداران ماہنامہ کی خدمت میں گذارش ہے کہ اپنے اپنے ذمہ واجب الادا زرِ رکنیت و بدلِ اشتراک ماہنامہ اپنی پہلی فرصت میں ارسال فرما کر مشکور کریں۔ تاکہ اس مفید قومی ادارہ کے پروگرام میں رکاوٹ نہ پیدا ہو سکے۔ (مینجر دفتر)

دریا بہ حباب اندر

(درس اخلاق)

(از سید علی جعفری مقالہ حیدرآباد دکن)

از کلماتِ شاہِ اولیاء حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام

توکّل در امور	نوازش بر ایتام	ادب در کلام
تقدّم در سلام	عطا در مقام	تعطیل در انتقام
تواضع با اکرام	شکر بر نعمت	عفو با قدرت
اجتناب از غیبت	قصور در شہوت	اصرار در طاعت
خوشروئی با عیال	ملامت با جہال	تامّل در جواب
اندازہ در معاش	دوری از کبر	وفا بر عہد
اکرام بہ مہمان	دلجوئی از غریباں	سرعت در خیر
امداد بر مظلوم	شفقت با مردم	عیادت مریض
ایثار بر مساکین	مخالفت با نفس	صبر در مصائب
نصرت بر جہاد	کنارہ جوئی از بخل	استقامت در کار
سعی در اخلاص	مصاحبت با نیکاں	تفکّر در امور

(مقالہ خصوصی) (قسط دوم)

معارف النبوۃ والامامت

(تحقیقات سید محمد حسین نقوی ۔ میڈیکل آفیسر۔ واہ)

(سلسلہ کیلئے معارف اسلام ماہ ستمبر صہ ۲۴ ملاحظہ فرمائیں)

اب ہم پھر سرخیل انبیا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ہم یہ کہہ رہے تھے۔ کہ حضور علیہ السلام مجتمع علم ہوتے ہوئے مرکز حیات و قدرت اور ارادہ ہیں۔ عند الحکما یہ امر مسلمات سے ہے۔ کہ روح کمالات کا خزانہ ہوتی ہے۔ اور نفس قوت تحریک کا۔ یعنی نفس بمنزلہ قوت محرکہ کے ہوتا ہے۔ کمالات روح کا اظہار بذریعہ نفس کے ہوتا ہے۔ نبی اکرم علیہ السلام جسد کائنات میں بمنزلہ روح کے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ وہ کونسی ہستی ہے۔ جو نفس رسول ہوتی ہوئی کمالات نبویہ کے اظہار کا باعث ہو۔ بالفاظ دیگر حیات معنوی کے حصول کا باعث اور سبب ہو۔ اس کے متعلق حضور علیہ السلام فرماتے ہیں۔ یا علی نفسک نفسی۔ یعنی اے علیؑ تیرا نفس میرا نفس ہے۔ معلوم ہوا کہ امیر علیہ السلام وہ وجود نورانی ہیں جو اس جسم کائنات میں حرکت پیدا کر رہے ہیں۔ یعنی آپ ہی متصرف فی العالمین ہیں۔ ذرہ ذرہ در تحت تصرف علیہ ہے۔ بالفاظ دیگر آپ ہی وہ محور ہیں جس پر یہ کائنات چکر لگا رہی ہے۔ آثار حیات فی الجسد کائنات بوجود علیؑ نمایاں ہیں۔ اس حقیقت کی وضاحت ہم دوسرا پہلو اختیار کرتے ہوئے کرتے ہیں جاننا چاہئے۔ کہ حیات نہیں ہے۔ مگر باجتماع روح و نفس اور جسم۔ جب درمیان سے نفس کو اٹھالیا جاتا ہے۔ تو جسم اس وقت بے جان ہو جاتا ہے۔ اب تمامی کائنات بمنزلہ جسم کے ہے۔ اور نبی اکرم علیہ السلام لولاک لما کا مصداق ہوتے ہوئے اس میں بمنزلہ روح کے ہیں۔ اب آثار حیات جسم تک بواسطہ نفس تو نہ پہنچیں گے۔ جو کہ نہیں ہے۔ مگر علیؑ کا وجود نورانی حیات ظاہری بایں طریقہ تشکیل پکڑتی ہے اب اس زندگی کی جو جان ہے۔ یعنی روحانی زندگی۔ وہ بھی اسی طرح ظہور میں آتی ہے۔ اس میں بھی یہی قانون کار فرما ہے۔ اس مقام پر یہ امر ملحوظ خاطر رکھیں کہ روح اور نفس کے درمیان جس قدر وسائط وعلائق اور ذرائع کم ہوگئے۔ اسی قدر شعاع اور آفتاب حیات حقیقی جسم پر نمایاں ہو کر پڑیں گی۔ اور اسی نسبت سے اوصاف موت کم ہو جاویں گے۔ حیات معنوی اسی وقت حاصل ہوگی۔ جب جسم کے لئے روح اور نفس کے درمیان کوئی فاصلہ قرار نہ دیا جاوے۔ یعنی نفس کو بلا فصل تسلیم کرنے سے معنوی زندگی حاصل ہوتی ہے۔ اب حضرت علیؑ علیہ السلام کو خلافت الہیہ کا وارث بلا فصل ماننے میں بھی یہی راز ہے۔ کہ آپ حیات معنوی کے حصول کا ذریعہ اور باعث ہیں۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ معرفت خدا حاصل ہوتی ہی نہیں۔ مگر بہ حیات حقیقی۔ لہذا معرفت خدا کے لئے متمسک بہ علیؑ علیہ السلام ہونا لابدو

ضروری جیسا کہ آپ نے ارشاد فرمایا۔ کہ لولا نحن ما عرف اللہ یعنی اگر ہم نہ ہوتے تو معرفت خدا کسی کو حاصل نہ ہوتی۔ پھر فرمایا لولا نحن ما عبد اللہ یعنی اگر ہم نہ ہوتے تو پھر خدا کی عبادت بھی نہ ہوتی۔ معلوم ہوا کہ یہی نفوس مقدسہ اول العارفین اور اول العابدین ہوتے ہوئے حصول معرفت الٰہیہ کے لئے وسیلہ اور سبب ہیں۔ علاوہ ازیں یہ امر مسلمات سے ہے۔ کہ مخلوق اول۔ مخلوق ثانی کے لئے علت فاعلی ہوتا ہے۔ لولاک لما ارشاد نبوی اس امر کا موید ہے۔ نیز حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں نحن صنائع ربنا والخلق بعد صنائعنا یعنی ہم اول مصنوع الٰہی ہیں۔ اور بعد میں عالم خلق ہماری مصنوعت ہے۔ (تصدیق کے لئے دیکھو تاریخ اعثم کوفی اردو۔ دیباچہ کوکب دری صوفی سید محمد صالح کشفی) بہر حال یہ ثابت ہو گیا۔ کہ یہ ذوات عالیہ بوجہ مصنوع اول و مجعول اول۔ مخلوق ثانی کے لئے علت فاعلی ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ علت اپنے جمیع معلومات پر حاوی ہوتی ہے۔ اور ان پر احاطہ تامہ رکھتی ہے۔ اور ہر ایک کے ساتھ مساوی الاقرب ہوتی ہے۔ یعنی اس کے لئے قرب و بعد مساوی و یکساں تمامی معلومات اس کے زیر نظر۔ بالفاظ دیگر وہ ناظر و حاضر علیٰ الجمیع معلولات ہوتی ہے۔ اس لئے حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ تمامی کائنات ہمارے لئے ایسی ہے۔ جیسی کہ ہتھیلی پر ایک درہم ہم اٹھارہ ہزار عالم کی سیر ایک آن میں کرتے ہیں۔ درآنحالیکہ ہم اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتے اسی حقیقت کو امیر المومنین علی علیہ السلام نے یوں بیان فرمایا۔ کہ انا عین اللہ و لسانہ الناطق فی خلیفہ یعنی ہم اللہ کی آنکھ ہوں اور مخلوق میں اس کی بولتی ہوئی زبان۔ یہاں سے مسئلہ حاضر و ناظر کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ اب اس نکتہ کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ کہ تمامی کائنات جو کہ عین نبی اکرم علیہ السلام سے قائم ہوتی ہے۔ وہ محاط ہے۔ اور آپ محیط ہیں۔ محاط۔ محیط کا احاطہ نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔ تاوقتیکہ وہ خود نہ بتلا دے۔ مگر وہ ہستی جو کہ آپکے منزلہ نفس ہے جسکے متعلق آپ نے فرمایا۔ ما عرفنی الا اللہ و علی یعنی کوئی شخص مجھے کما حقہ نہ پہچان سکا۔ مگر اللہ اور علیؑ یعنی آپ کو یا عالی جانتا ہے بحیثیت خالق ہونے کے۔ یا علی جانتا ہے۔ بوجہ آپ کے نفس ہونے کے۔ اور عالی کو پہچاننے کے لئے ان کا دامن پکڑنا ہو گا۔ جیسا کہ خود اس نے فرمایا۔ کہ کنت کنزاً مخفیا ... یعنی میں محمود تو مخفی تھا۔ مگر محمدؐ نے حجاب کبریائی کو اٹھایا۔ اور اپنے وجہ نورانی پر رکھ کر مجھ کو ظاہر کر دیا۔ اس مقام کی حقیقت کو سر اللہ فی العالمین علی ابن ابی طالب علیہ السلام بایں الفاظ بیان فرمایا۔ کہ محمد حجاب اللہ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجاب کبریا ہیں۔ یہ معاملہ ابھی بین الاجمال والتفصیل تھا۔ کیونکہ حضور علیہ السلام کا مقام۔ مقام راز ہے۔ مگر تکمیل کر دیا علی نے۔ کہ وہ وجہ اللہ بن کر جلوہ گر ہوا۔ دیکھنے والوں کو اس کی وجہ نظر نہ آئی۔ عالی اور علی میں فرق نہ کر سکے۔ یہ الف کا فرق کیسے معلوم ہو سکتا تھا جب کہ یہ رمز احدیت کو اپنے اندر لئے ہوتے ہیں۔ یہاں پہ جاننا چاہیئے۔ کہ احد اور احمدؐ میں بھی میم کا فرق ہے۔ مگر یہاں وجہ احدیت پر یعنی

چہرہ الف احد پر میم کا پردہ ہے۔ اور ادھر پردہ نہیں۔ اسی واسطے علی علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ محمد حجاب اللہ۔ یعنی حضور علیہ السلام مقام حجاب پر ہیں۔ کیونکہ نبوت پر فائز ہیں۔ امیر علیہ السلام وحی مطلق ہوتے ہوئے مقام کشف پر ہیں۔ جیسا کہ آپ کے ارشاد لو کشف الغطا لما ازددت یقیناً سے ظاہر ہے۔ بدیں وجہ بعض کوتاہ بین حضرات کو آپ پر الوہیت کا شبہ ہو گیا۔ اور آپ نے انا عبد من عبید محمد کہہ کر ایسے لوگوں کی راہ نمائی کی۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ حضرت علی علیہ السلام نے عبداللہ کہہ کر کیوں نہ لوگوں کو تنبیہ کی۔ اگر کہا تو عبد محمد کہا۔ وجہ اس کی یہ ہے۔ کہ ولایت مآب علیہ السلام کی ہستی نور توحید کو اپنی عبدیت مطلقہ میں پہلے ہی چھپائے ہوئے تھی۔ مگر چونکہ آپ مقام اظہار پر فائز تھے۔ بدیں وجہ شعاع نور توحید پردۂ عبدیت مطلقہ سے چھن چھن کر باہر اسقدر آرہی تھیں۔ کہ دیکھنے والوں کی نظریں جو کہ کحل المعرفت سے عاری تھیں۔ شعاعوں کے پیچھے پردہ عبدیت کو نظر انداز کرتے ہوئے آپ کو خدا سمجھنے لگیں۔ اب علی علیہ السلام نے جو کہ توحید کے حقیقی علمبردار تھے۔ اس کے لئے یہ انتظام کیا۔ کہ انا عبدٌ من عبید محمدؐ کہہ کر اپنے آپ کو مقام حجاب پر پہنچا دیا۔ جیسا کہ محمد حجاب اللہ سے ظاہر ہے۔ دوسری وجہ اس کی یہ بھی ہو سکتی ہے۔ کہ آپ جانتے تھے۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انی عبد اللہ کہا تھا۔ مگر اس پر بھی بعض لوگوں نے آپ کو ابن اللہ کہہ ہی دیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بغیر باپ کے ولادت۔ اور ان کا تکلم فی المہد وغیرہ ان کو حیرت و استعجاب میں ڈالتا تھا۔ ادھر حضرت علی علیہ السلام کی ذات مظہر العجائب تھی۔ مہد میں اژدہا کا چیرنا۔ دست رسول پر پیدا ہوتے ہی قرآن سنانا وغیرہ لوگوں کے سامنے تھا۔ لہذا حضرت علی علیہ السلام کے قول انی عبد اللہ پر ضعیف العقل ولمعرفت لوگ کیسے کان دھر سکتے تھے۔ لہذا حضرت علی علیہ السلام نے سمجھا کہ ایسے آدمیوں کے لئے عبدیت مطلقہ کا ایک پردہ جو کہ انوار تجلیات الٰہیہ کے لئے بمنزلہ صدف کے تھا۔ کافی نہیں ہو سکتا۔ بدیں وجہ آپ نے دوہرا پردہ کیا یعنی عبد عبداللہ بنے۔ یعنی اللہ کے بندے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عبد۔ انا عبدٌ محمدؐ کہنے میں علی کا یہ مقصد تھا۔ علاوہ ازیں آپ کا یہ فرمانا اس بات پر دلالت کرتا ہے۔ کہ آپ نبی اکرم علیہ السلام کے اس قدر مطیع و منقاد ہیں۔ کہ آپ نبوت و رسالت کے لئے برہان مجسم ہیں۔ یعنی مابہ النبوۃ قرآن ہے۔ اور اس پر عمل پیرا ہونا یہ ظاہر کرتا ہے۔ کہ تعلیمات قرآن قابل عمل ہیں۔ اور علی بالقرآن علم قرآن کو مقتضی ہے۔ ادھر حضرت علی علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ ھذا کتاب اللہ الصامت وانا کتاب اللہ الناطق۔ یعنی یہ کتاب صامت ہے۔ اور میں کتاب ناطق ہوں۔ ظاہر کرتا ہے۔ کہ آپ کی ذات گرامی نبی اکرم علیہ السلام کے لئے کافی ہے۔ قرآن میں خود خدا اس کی شہادت ہے۔ کہ قل کفیٰ باللہ شہیداً بینی وبینکم ومن عندہٗ علم الکتاب۔ مولوی عبداللہ امرتسری ارجح المطالب میں یوں رقمطراز ہیں۔ کہ من عندہٗ

علم الکتاب کا مصداق حضرت علی علیہ السلام ہیں۔ پس معلوم ہوا۔ کہ آپ حضور علیہ السلام کے لئے کافی
ہیں۔ آیت سے پتہ چلتا ہے۔ کہ خدا نے اس بات کی نفی کر دی ہے۔ کہ رسول خدا کی کائنات میں سے سوائے
اللہ کے کوئی کفایت نہیں کر سکتا۔ ایک دوسرے کے لئے وقتی طور پر مدد و معاون ہو جاتا الگ حیثیت
رکھتا ہے۔ خدا وہ ہے۔ جو ہر ایک کی اس کے ماحول کے مطابق ہر وقت اور ہر آن کفایت کرتا ہے۔
جس کا نتیجہ اس موجود کو منزل مقصود تک پہنچا دینا ہے۔ معلوم ہوا۔ کہ منزل مقصود تک رسائی کفایت
الٰہیہ پر مبنی ہے۔ اب وہ نبی جو کہ نبی الانبیاء ہے۔ نبوت کی طولی ترقی جس پر منتہی ہوتی ہے۔ جو کہ تمام
کائنات کا مقصد ہے۔ بلکہ مقصود و مراد خداوندی ہے۔ جیسا کہ انت المراد وانت الحبیب وانت
خیرتی من خلقی وعزتی وجلالی لولاک لما خلقت الافلاک سے ظاہر ہے۔ کیا
کائنات میں سے کوئی اس کی کفایت کر سکتا ہے۔ کیا مادیت نورانیت کے لئے۔ ظلمت نور کے لئے۔
جہل۔ علم کے لئے کافی ہو سکتے ہیں۔ ایں خیال است ومحال است وجنوں۔ اس لئے خداوند تعالیٰ
فرماتے ہیں۔ کہ اے حبیب آپ جیسی عظیم المرتبت ورفیع المنزلت ہستی کے لئے میں کافی ہوں۔ مگر
چونکہ میرا قانون اسباب وذرائع کو عموماً چاہتا ہے۔ جو کہ بیشتر مصالح پر مبنی ہے۔ اس لئے عالم ایجاد
میں آپ کی کفایت وہی کر سکتا ہے۔ جو کہ میری علمی کتاب کا علم اپنے سینہ میں رکھتا ہو۔ علم بحیثیت
علمی صورت کے تو میری کتاب میں ہے۔ اب وہ جس میں علمی حیثیت سے یہ علم ہوگا۔ وہ آپ کے لئے
کافی ہے۔ اور وہ وہ ہوگا جو میری علمی کتاب کو جو کہ صامت ہے۔ نطق عطا کر دے۔ اب حضرت علیؑ
علیہ السلام فرماتے ہیں۔ کہ انا کتاب اللہ الناطق۔ اس سے یہ حقیقت مانند آفتاب ظاہر ہے۔ کہ نبی اکرم
علیہ السلام کے لئے حضرت علی علیہ السلام کافی ہیں۔ اور آپ کی یہ کفایت کفایت الٰہیہ کی مظہر ہے۔ یعنی
خداوند تعالیٰ نے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کفایت علیؑ کے ذریعہ کی ہے۔ اب نبی اکرم علیہ السلام
کے لئے حضرت علی علیہ السلام کافی ہوں گے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ امیر علیہ السلام کی کفایت کہاں
تک ہوگی۔ جواب ظاہر ہے۔ جہاں تک رسول خدا کی رسالت احاطہ کئے ہوئے ہے۔ وہاں تک
کفایت علی ہوگی۔ اور اس وقت سے ہوگی جب سے رسالت ہے۔ علیؑ اوّل میں بھی کافی آخر میں بھی
کافی۔ ظاہر میں کافی اور باطن میں کافی۔ اس لئے آپ فرماتے ہیں۔ نصرت الانبیاء سرّاً و
نصرت المحمد جہراً یعنی میں نے انبیاء علیہ السلام کی مدد کی ہے سرّی طور پر اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم کی ظاہراً امداد کی ہے۔ خیر اب ہم پھر اپنے بیان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ہم کہہ رہے تھے
کہ ارشاد قدرت ہے۔ کہ فاحببت ان اعرف ...... میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں پس پیدا
کیا خلق کو۔ معلوم ہوا ابھی تک کوئی ایسی ہستی موجود نہ تھی۔ جو کہ اس کی معرفت تامہ رکھتی ہو۔ لہٰذا
یہ ہستی جو کہ خلعت وجود سے آراستہ ہو رہی ہے وہ خداوند تعالیٰ کا تعارف کرانے کے لئے

خالقِ حقیقی کی معرفتِ تامہ رکھتی ہوگی۔ اس سے یہ بات عیاں ہوئی کہ کوئی بھی خدا کی صحیح معرفت عطا نہیں کر سکتا۔ مگر وہ جو کہ معرفتِ تامہ رکھتا ہو۔ کوئی وقت اور کوئی آن اس پر ایسی نہ آئی۔ جب کہ وہ معرفت سے عاری ہو۔ اور نہ آنے کا امکان ہو۔ بالفاظِ دیگر وہ کفر و شرک۔ گناہ و خطا اور سہو و نسیان سے ہر وقت پاک و پاکیزہ اور مبرا ہو۔ یعنی وہ عیوبِ جسمانیہ، نفسانیہ اور عقلانیہ سے پاک ہونا چاہیئے۔ اور نہ ہی ان عیوب کا طریان اس پر کسی وقت ممکن ہو۔ کھلے الفاظ میں یوں کہیئے۔ کہ وہ ہستی جو کہ خالق و مخلوق کے درمیان ذریعہ معرفت ہو اُس کا معصوم ہونا ضروری۔ اس لئے کہ صاحب عصمتِ کلی کو ہی معرفتِ کلی حاصل ہو سکتی ہے۔ غیر معصوم خداوند تعالیٰ کا تعارف جیسا کہ چاہیئے نہیں کرا سکتا۔ اس حقیقت کو ہم دوسرے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ جاننا چاہیئے۔ کہ خداوند تعالیٰ کو اپنا تعارف کرانا محبوب ہے۔ اور یہ بھی محبوب ہے۔ کہ مخلوق صحیح معرفت اُس کے متعلق رکھے۔ یعنی کمی و بیشی سے وہ بات پاکیزہ ہوتی ہے۔ جو کہ اُس کے متعلق مخلوق تک پہنچے۔ اور یہ نہیں ہو سکتا۔ جب تک واسطہ بین الخالق والمخلوق ہر کمی و بیشی اور غلطی سے محفوظ و معصوم نہ ہو۔ اسی حفاظت کا نام عصمت ہے۔ دوسرے یہ بات بھی ظاہر کہ اپنا تعارف کرانا خدا کو ہر وقت محبوب و مطلوب ہے۔ لہذا معصوم ہادی کا وجود ہر زمانہ میں لابد و ضروری۔ لیس فاحببت ان اعرف . . . . سے مراد یہ ہے۔ کہ خداوند تعالیٰ اپنا تعارف کرانے کے لئے ایسی ہستی عظیم کو معرضِ وجود میں لا رہے ہیں۔ جو کہ عصمت کے زریں لباس میں ملبوس ہوگی۔ اور اُس کے معصوم اجزا ہر زمانہ میں اس خدائی مقصد کو پورا کرتے رہیں گے۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ کہ حضور علیہ السلام جسماً و نفساً اور روحاً طاہر و مطہر اور معصوم ہیں۔ اب وہ نفوسِ نورانیہ جن کے متعلق حضور علیہ السلام رطب اللسان ہوں کہ یا علی لحمک لحمی و دمک دمی۔ انا و علی من نور واحد۔ الحسین منی و انا من الحسین۔ الفاطمۃ بضعۃ منی وغیرہ اور جو ابناءنا و نساءنا اور انفسنا کا مصداق ہوں۔ وہ بھی جسمانی نفسانی اور عقلانی و روحانی عیوب سے پاک و پاکیزہ ہوں گے۔ یعنی معصوم۔ اس بیان کی تصدیق کے لئے دیکھو ارجح المطالب عبید اللہ امرتسری۔ مودۃ القربیٰ سید علی ہمدانی اور البلاغ المبین آغا محمد سلطان مرزا۔ ہم ثابت کر چکے ہیں۔ کہ عصمتِ کلی و معرفتِ کلی لازم و ملزوم ہیں۔ لہذا یہ ہستیاں منبع علم و خزانۂ اسرارِ الٰہیہ ہوں گی۔ کیونکہ عصمتِ کلی علمِ کلی کا نتیجہ ہے۔ ان میں سے ایک کا تعارف نبی اکرم علیہ السلام نے یوں کرایا۔ کہ انا مدینۃ العلم و علی بابہا جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ حضرت علی علیہ السلام کی ذات گرامی جمیع کمالاتِ علمی و عملی سب صفات و کمالاتِ احمدی کے اظہار و تعارف کے ذریعہ ہے۔ بلکہ عارفین نے فضلنا بعضہم علیٰ بعض کی تفسیر میں لکھا ہے۔ کہ بسبب قربِ خداوندی بلحاظ اعتدال و استواء کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام رفیع ہے۔ ایک کو ایک پر فضیلت ہے۔ جس کا حصول بغیر از جمیع

سائل بر ورولایت مآب علیہ السلام ناممکن یا یوں کہیئے کہ عطائے نعمت فضیلت جو کہ فیض ہے فیض
خداوندی کا۔ دستِ علیؑ میں ہے۔ کلام الٰہی میں اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے۔
کہ ان الفضل بیداللہ یعنی فضل نہیں ہے۔ مگر بیداللہ میں۔ معلوم ہوا کہ یہ وجود مقدس خازن فیض
خداوندی ہیں۔ قول رسول واللہ معطی وانا قاسم اس کا موید۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ معرفت الٰہیہ نعمت غیر
مترقبہ ہے جس کے عطا کنندہ بھی یہی ہیں۔ ہم ثابت کر آئے ہیں۔ کہ خدا کو اپنا تعارف کرانا ہر زمانہ
میں محبوب۔ لہذا قاسم نعمت معرفت ایزدی کا وجود بھی ہر زمانہ میں ضروری۔ نبی اکرم علیہ السلام نے
اس حقیقت کو پُرزور الفاظ میں یوں بیان فرمایا۔ کہ من لم یعرف امام زمانہ مات میتۃ
جاھلیۃ۔ (دیکھو منصب امامت اسمٰعیل شہید دہلوی) لفظ زمانہ کی ضمیر اس بات کو ظاہر کرتی
ہے کہ امام جو کہ معرفت کا عطا کرنے والا ہے جس کی معرفت عین عرفان الٰہی ہے۔ اس کا ہر وقت اور
زمانہ میں موجود ہونا ضروری۔

بہر حال یہ ظاہر ہے۔ کہ یہ ہستیاں جو کہ خلعت عصمت سے آراستہ ہیں۔ خدا کا تعارف کرانے کے لئے
پیدا کی گئیں۔ یہی نفوس عالیہ تھے۔ جو کہ قبل از تخلیق آدم موجود تھے۔ دیکھو نزھتہ المجالس مولوی عبدالرحمٰن
شافعی المذہب) ان سے ایک کا پتہ خداوند تعالٰی ان الفاظ سے دے رہے ہیں۔ کہ ماجبیت ان اعرف
... یعنی میں نے محبوب گردانا اپنا تعارف کرانا لہذا پیدا کیا خلق کو خلق سے مراد روح نورانیہ محمدیہ
جو کہ اول مخلوق ہے۔ حضرت علیؑ علیہ السلام اس حقیقت کی تائید میں فرماتے ہیں۔ اول حقیقۃ ھادیۃ
جامعۃ محیطۃ نور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یعنی اول حقیقت ہادیہ جامعہ محیطہ نہیں ہے۔ مگر حضور
علیہ السلام نور مبارک۔ مولوی احمد یار خاں تفسیر نعیمی میں لکھتے ہیں۔ کہ نبی آدم علیہ السلام نے فرمایا۔ انا
من نور اللہ وکل شیء من نوری۔ "حبیب خدا" میں مولوی اشرف علی تھانوی نے بہ اختلاف الفاظ
بطور فٹ نوٹ حدیث نور درج کی ہے۔ اس حدیث کی شرح میں شیخ عبدالخالق محدث دہلوی مدارج
النبوۃ میں لکھتے ہیں۔ کہ ایک نور خداوند تعالٰی کا ذاتی ہے۔ اور ایک نور صفاتی۔ تمام انبیاء علیہم السلام
نور صفاتی سے خلق ہوئے ہیں۔ اور ہمارے نبی اکرم علیہ السلام نور ذاتی سے۔ شیخ صاحب نے جو کہا ہے
اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔ جاننا چاہیئے۔ کہ یہ امر مسلمات سے ہے۔ کہ کثرۃ الاسماء تدل علی کثرۃ
الصفات۔ یعنی تکثیر فی الاسماء کثرت فضائل و اوصاف پر دلالت کرتی ہے۔ بالفاظ دیگر جس قدر
کسی کے اوصاف زیادہ ہونگے۔ اسی قدر اس کے اسماء زیادہ ہونگے۔ صفات الٰہیہ چونکہ لاانتہا
لاتحصی ہیں۔ بدیں وجہ اسماء الٰہی لاتعداد ہیں۔ بعض محققین کا یہ کہنا کہ اسم عین مسمّٰی ہوتا ہے
تو اس کے متعلق عرض ہے۔ کہ اسم کو صفت بھی خیال کیا جاتا ہے۔ جیسے کہ رحیم کریم اور رؤف اسماء
ایزدی ہیں۔ اور صفات خداوندی کہلاتے ہیں۔ چونکہ صفات خداوندی عین ذات ہیں۔ لہذا

لہٰذا اسم عین مسمّی ہوا، ایسا کہنا صرف ذاتِ خداوندی کے لئے ہے۔ چونکہ صفاتِ الٰہیہ عین ذات ہیں
لہٰذا ذات اور صفات میں کوئی مغایرت نہیں یعنی صفات زائد بر ذات نہیں۔ لہٰذا اسم ذاتی اور اسم
صفاتی کی تقسیم قابلِ توجہ نہیں۔ یعنی اسماء جب صفات کہلاتے ہیں اور صفات عین ذات ہیں۔ تو پھر تقسیم
نہیں۔ علاوہ ازیں یہ قاعدہ ہے۔ کہ اسم مسمّی کو محدود کر دیتا ہے۔ ذاتِ خداوندی حدود سے بلند و بالا
اور پاک و پاکیزہ ہے۔ لہٰذا اُس کا کوئی اسم ذاتی نہیں۔ (تفصیلی بحث کے لئے دیکھو مواعظ حسنہ علامہ
حیدری) اصل میں بات یہ ہے۔ کہ اسم اللہ جامع جمیع صفات اور اسماء ہے۔ باقی تمام صفات کو
حاوی۔ اور اُن کے لئے بمنزلہ اصل اور ذات کے ہے۔ مطلب یہ کہ جب اللہ کہا جاوے۔ تو اس
میں باقی تمام صفات خداوندی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ فرض کرو کہ اگر کسی کو بنا بر ظاہر صفات الٰہیہ
کا علم نہ ہو۔ سوائے اسم اللہ کے دوسرا اُس کو معلوم نہ ہو۔ اور وہ تمام اسماء الٰہیہ کے فیوض سے
مستفیض ہونا چاہتا ہو۔ تو پھر اس کو اسم اللہ کہنا چاہیئے۔ اور یہ عین ذات ہوتا ہوا۔ ذاتِ خداوندی
کو پہنچا دے گا۔ اس لحاظ سے اِس کو اسم ذاتی کہا جاوے گا۔ ورنہ فی الحقیقت یہ بھی اسم صفاتی ہے۔
جیسا کہ ارشادِ خداوندی سے ظاہر ہے۔ کہ اُدْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ
الْحُسْنٰى۔ ویسے زبان زد عام یہی ہے۔ کہ اسم اللہ ذاتی ہے۔ اور وہ انہیں معنوں میں ہو سکتا ہے جیسا
کہ ہم نے لکھا ہے کہ یہ جامع جمیع اسماء ہے۔ ورنہ خدا کے لئے کوئی اسم ذاتی قرار دینا ہرگز درست
نہیں۔ اب یہ جو شیخ عبدالخالق محدث دہلوی نے کہا ہے۔ کہ تمام انبیاء نورِ صفاتی سے خلق ہوئے
ہیں۔ اور حضور علیہ السلام نورِ ذاتی سے۔ تو مطلب اس کا یہی ہے۔ کہ تمام انبیاء باقی اسماء کے
مظہر ہیں۔ اور نبی اکرم علیہ السلام اسم اللہ کے مظہر ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے۔ کہ اسم اللہ جامع جمیع اسماء ہے
لہٰذا اس کا مظہر جامع جمیع مظاہر ہوگا۔ اور یہ بھی مسلّم امر ہے۔ کہ ہر مظہر اُسی اسم سے فیض پاتا ہے۔
جس کا وہ مظہر ہے۔ اور وہ اسم اُس کے لئے رب کہلاتا ہے۔ تو اس لحاظ سے مظہرِ اسم اللہ رب المظاہر
ہوا۔ ہر مظہر ایک عالم کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا مظہرِ اسم اللہ رب العالمین ہوا۔ یعنی محمود عالم وجود
میں رب العالمین ہے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عالم ایجاد میں رب العالمین ہیں۔ سامی میں رب العالمین
اور علی بھی پڑھئے اس کے لئے دیکھو اسرار و مظاہرہ۔ اور مسئلہ رب النوع کو کتب ہی اور ضرورت
الامام میں۔ اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ ہو سکتا ہے۔ کہ کوئی ایک اسم کا مظہر
ہو اور کوئی دو کا اور کوئی تین کا علیٰ ہذا القیاس۔ چونکہ ہر مظہر اپنے اسم کی جس سے وہ مستفیض ہوتا ہے۔
اُسی کی معرفت رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ دوسرے اسماء کی معرفت نہ رکھتا ہوگا۔ اور یہ نقص ہے؟ جواب اس کا
یہ ہے۔ کہ چونکہ صفاتِ خداوندی عین ذات ہیں۔ لہٰذا سب ایک ہیں۔ مثلاً علم و قدرت اور رحمت
اس کی صفات ہیں۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ قدرت میں علم کا مفہوم نہیں اور علم میں قدرت کا۔

رحمت ہیں علم کیا علم میں رحمت کا وغیرہ۔ سب صفات خداوندی عین ذات ہوتے ہوئے آپس میں تعلق رکھائے ہوئے ہیں۔ فرض کرو کوئی اسم علیم کا مظہر ہے۔ تو یہ مظہر تمام اسماء الٰہیہ کی اجمالی طور پر معرفت رکھتا ہے۔ اور اسم علیم کی تفصیلی طور پر۔ مطلب یہ کہ کمالاتِ علمیہ کا ظہور اُس سے عموماً ہوگا۔ اور باقی کا عند الضرورت یہ سب کچھ ہم خصوصاً انبیاء علیہم السلام کی بابت کہہ رہے ہیں۔ اب ان میں تفاوت فی الدرجات بسبب وسعت ظرف کے ہوگا۔ تفصیل اس حقیقت کی یہ ہے۔ کہ جمیع صفات کمالیہ کا مرکز علم ہے۔ اختلاف فی المدارج و مراتب کا انحصار علم پر ہوگا۔ نیز صفات خداوندی کا اظہار نزاکتِ وقت اور موقعہ کے لحاظ سے ہوگا۔ جس کا وہ علم رکھتا ہوگا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ کبھی کسی صفت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور کبھی کسی کا۔ اگر موقعہ کے لحاظ سے کسی نبی سے کسی صفت کا اظہار لگاتار اور متواتر ہوتا رہا ہو۔ تو کہا جاتا ہے۔ کہ وہ اس صفت کا خاص کر مظہر تھا۔ حالانکہ باقی صفات کا بھی مظہر ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو نبی اکرم باعثِ ایجادِ عالم علیہ السلام نے ان الفاظ میں ادا کیا۔ کہ من احب ان ینظر الی اسرافیل فی ہیبتہ والی میکائیل فی مرتبتہ والی جبرئیل فی جلالہ والی آدم فی علمہ وسلمہ والی نوح فی خشیتہ والی ابراہیم فی خلتہ والی یعقوب فی حزنہ والی یوسف فی جمالہ والی موسیٰ فی مناجاتہ والی ایوب فی صبرہ والی یحییٰ فی زہدہ والی عیسیٰ فی سنتہ والی یونس فی ورعہ والی محمد فی حسبہ وخلقہ فلینظر الی علی بن ابی طالب ..... حالانکہ حضرت آدم علیہ السلام اسم علیم کے علاوہ باقی اسماء کے بھی مظہر تھے۔ علاوہ ازیں دیکھئے کہ حضرت جعفر علیہ السلام کو صادق حضرت محمد علیہ السلام کو باقر العلوم حضرت رضا علیہ السلام کو ضامن کہا جاتا ہے۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی آئمہ علیہ السلام میں یہ صفات نہ تھیں۔ بلکہ مطلب صرف یہ ہے۔ کہ موقعہ و محل کے لحاظ سے ان صفات کا ظہور اُن سے بکثرت اور تواتر سے ہوا ہے۔ بہرحال یہ عیاں ہوگیا۔ کہ حضور علیہ السلام مظہر اسم اللہ ہوتے ہوئے جامع جمیع مظاہر ہیں۔ جب معاملہ ایسا ہے تو باقی تمام مظاہر ان کی معرفت رکھتے ہونگے اور آپ کا وجود سب سے پہلے ہوگا۔ کیونکہ آپ ہی نورِ معرفت کا منبع و مرکز اور خزانہ ہیں۔ سب کو فیض آپ ہی سے ملا ہے۔ جیسا کہ علامہ سید محمد سبطین صاحب اعلی اللہ مقامہ نے حدیث مدینہ کے تحت کشف الاسرار میں لکھا ہے۔ یہی وہ ہستی ہے جس کی خبر ان الفاظ قدسی دے رہی ہے۔ کہ احببت ان اعرف..... یعنی میں نے محبت سے دیکھا اس امر کو پہچانا جاؤں۔ لہٰذا اپنے حبیب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیدا کیا۔ پھر فرمایا لکی اعرف اور میں پہچانا گیا۔ معلوم ہوا۔ کہ مقصد خداوندی بوجود نورانیہ محمدیہ پورا ہوا جیسا کہ ارشاد رسالت مآب علیہ السلام سے ظاہر ہے۔ کہ نحن یعنی ہمارا وجود مقدس وہ افق عالیہ ہے۔ جہاں سے شعاع آفتاب حریت الٰہیہ نکل رہی ہے۔ مگر لیس ہو یعنی ہمارا کتم عدم سے وجود میں اس حقیقت کو لے کر آنا اور پھر قائم رہنا بوجود واجب الوجود ہے۔ بالفاظ دیگر یہ عالی نفوس مظہر قیوم ہوتے ہوئے خود قائم اور جہاں میں علم توحید گاڑنے والے ہیں۔ یہی وجود مقصد خدائی کے ترجمان ہیں۔ خدا کو اپنے مقصد کو مخلوق تک پہنچانا

ہر وقت محجوب۔ مقصد الٰہیہ نہیں ہے۔ مگر اپنا تعارف کرانا جیسا کہ ماحیقت سے ظاہر ہے۔ لہٰذا ایسے وجود کا ہر زمانہ میں ہونا لابد و ضروری۔ ایسا وجود ہر وقت ہونا چاہیئے۔ جو مخلوق تو ہوگا۔ خالق کا پتہ دیتا ہو اور بانگ دہل یہ کہتا ہے۔ کہ خالق و مخلوق میں سے کسی کے متعلق جو چاہو۔ مجھ سے پوچھ لو۔ ایسی ہستی وہی ہو سکتی ہے۔ جو سریر آرائے سلونی پر متمکن ہو۔ یا وہ ہوگی۔ جو کہ سَلُونی ماشئتم کا تاج قرآنی اپنے سر پر رکھتی ہوئی فَتَلَّی بہ خبیرا کا مصداق ہو۔ پس معلوم ہوا کہ یہ نفوس قدسیہ علیم و خبیر ہوتے ہوئے مقصد خدائی کو پورا کر رہے ہیں۔ اور یہ اس لئے کر رہے ہیں۔ کہ خود مقصود و مراد ایزدی ہیں۔ جیسا کہ حدیث قدسی سے ظاہر ہے۔ ارشاد رب العزت ہے۔ کہ انت المراد و انت المرید وانت خیرتی من خلقی وعزتی وجلالی لولاک لما خلقت الافلاک۔ یعنی اے حبیب تو ہی وہ ہستی ہے جس میں میرا مقصد و ارادہ بند ہے۔ تو ہی صاحب ارادہ ہے۔ اور تو ہی جمیع مخلوقات ارضی و سماوی سے افضل و برتر ہے۔ مجھے اپنے عزت و جلال کی قسم اگر تجھ کو پیدا نہ کرنا مقصود نہ ہوتا تو کوئی چیز خلعت وجود سے آراستہ و پیراستہ نہ ہوتی۔ معلوم ہوا کہ دایرہ تخلیق کا مرکز حضور علیہ السلام ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ دایرہ کا وجود مرکز پر انحصار رکھتا ہے۔ یعنی مرکز سے پہلے ہوتے ہوئے دایرہ کی تکمیل کا باعث ہوتا ہے۔ اسی ہستی عظیمہ کے متعلق خدا فرماتا ہے کہ لکی عرف ۔۔۔۔ کہ میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ السلام کے ذریعے سے پہچانا گیا۔ خدا کی ان شان و شوکت۔ عزت و جلال اور سطوت و جبروت خداوندی کو مدنظر رکھتے خیال ہی سے عقل دنگ۔ زبان گنگ اور دل مرعوب نظر آتے ہیں۔ ایک ہیبت طاری ہو جاتی ہے بایں ہمہ ایزد متعال فرماتا ہے۔ کہ لکی عرف کہ میں اپنے حبیب کے ذریعے سے پہچانا گیا۔

معلوم ہوا حضور علیہ السلام اس مقام اور منزل پر فایز ہیں۔ جہاں ملائکہ مقربین بھی پر نہیں مار سکتے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

فرشتہ گرچہ دارد قرب درگاہ
نگنجد در مقام لی مع اللہ
ز راہ ملک را پر بسوزد
جمال خود را پا و سر بسوزد

حضرت علی علیہ السلام خود یوں گوہر فشانی کرتے ہیں۔ کہ "ہمارا امر نہایت سخت ہے۔ اس کو نہ کوئی نبی مرسل اور نہ ملک مقرب برداشت کر سکتا ہے"

(باقی آئندہ)

محمد حسین نقوی میڈیکل آفیسر الفوجی کیمپ
ہسپتال واہ۔ ضلع کیمبل پور

(قسط ۳)

مسافرت حضرت امام حسین علیہ السلام بعراق

(مدینے سے کربلا تک)

(از قلم آقائے الحاج سید الف شاہ صاحب پاکنہاد)

(سلسلہ کے لئے دیکھئے "معارف اسلام" ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ صد ۲۳)

(۹) **شراف**۔ بطن عقبہ سے چلنے کے بعد کاروان اہل بیت شراف کے قریب پہنچا اور رات وہیں بسر کی۔ صبح کے وقت امام حسین علیہ السلام نے اپنے خادموں کو فرمایا کہ اندازے سے زیادہ پانی اپنے ساتھ ذخیرہ رکھیں۔ خدام نے گھوڑوں اور اونٹوں کو پانی پلا کر جس قدر زیادہ پانی اپنے ساتھ رکھ سکتے تھے اونٹوں پر بار کیا اور اس منزل سے چل پڑے۔ امام حسین علیہ السلام دو منزلوں سے پانی کی زیادہ سے زیادہ مقدار جو اونٹوں پر لادی جا سکتی تھی اپنے ساتھ لا رہے ہیں کیونکہ آنحضرت امام وقت ہیں۔ شہید علی الناس ہیں اور اپنے علم امامت سے جانتے ہیں کہ مخالفین کے ایک ہزار سوار حضرت کے محاصرے کے لئے آرہے ہیں اور شدت گرما کی وجہ سے تشنگی سے بیتاب ہونگے۔ ان کو پانی پلانا ضروری ہے۔ جو شخص معرفت امام نہیں رکھتا وہ یہ اسرار نہیں سمجھ سکتا۔

آمد حُر ریاحی۔ شراف سے نکل کر کارواں اہل بیت ظہر کے وقت تک چلتا رہا اور پھر گرمی کی وجہ سے ٹھیر گیا۔ ناگاہ ایک شخص نے بلند آواز سے تکبیر کہی، امام حسینؑ نے اس کا سبب پوچھا تو اس نے عرض کی۔ "مجھے دور سے ایک نخلستان دکھائی دیا ہے اور اس خیال سے کہ ہم کسی آبادی کے نزدیک ہیں خوشی میں آکر میں نے تکبیر کہدی ہے۔" بعض ہمراہیوں نے اس خیال کی تکذیب کی کیونکہ وہ اس رستے سے کاملاً آشنا تھے اور جانتے تھے کہ اس بیابان میں کوئی نخلستان نہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو سوائے گھوڑوں کے سروں اور سر نیزوں کے کوئی دوسری چیز نہیں دیکھتے۔ اتنے میں وہ منظر قریب آگیا۔ معلوم ہوا کہ ابن زیاد کے سوار ہیں جو اس بیابان میں مراقبت راہ پر مامور ہیں۔ لیکن ابھی یہ معلوم نہ تھا کہ یہ دشمن کے سوار امام حسین علیہ السلام کے ہوا خواہ ہیں یا بدخواہ اور ان کی ماموریت کس نوع کی ہے۔ پس ضروری تھا کہ ایسے مواقع پر احتیاط کو ہاتھ سے نہ دیا جائے اور بر طبق قواعد سپاہیگری مخدرات و ناموس اہل بیت نبوت کے لئے کوئی ایسی موزوں جگہ تلاش کی جائے جو موقعیت نظامی کے لحاظ سے مفید ثابت ہو یعنی جنگ چھڑ جانے کی صورت میں اہل بیت نبوت کو وہاں محفوظ رکھا جا سکے۔ امام حسینؑ نے پوچھا کیا یہاں کوئی ایسی جگہ

ہے کہ ہم اس کو اپنی پناہ گاہ قرار دے سکیں اور بصورت جنگ اس پناہ گاہ کو اپنے عقب میں قرار دے کر دشمن کا مقابلہ کریں۔ زہیر ابن القین نے عرض کی "ہاں۔ یہاں نزدیک ہی ایک پہاڑی ہے۔ جس کو "ذو حسم" کہتے ہیں پس بہتر یہ ہے کہ ہم بائیں طرف کو چلیں اور دشمن سے پہلے اس پہاڑی پر قبضہ کر لیں اور اس کو اپنی جائے پناہ قرار دیں"۔ امام علیہ السلام نے اس طرف کا رخ کیا۔

اس عرصے میں آنے والے سوار بھی نمودار ہو گئے۔ ان نوواردین نے جب دیکھا کہ امام حسینؑ اور حضرت کے ہمراہی اصلی راستے کو چھوڑ کر پہاڑی کی طرف جا رہے ہیں۔ تو وہ بھی اپنے راستے سے ہٹ کر پہاڑی کی طرف چلے۔ لیکن امام علیہ السلام پہلے ہی وہاں پہنچ کر پہاڑی پر قبضہ کر چکے تھے۔ اتنے میں یہ گروہ بھی آپہنچا جو حر ابن یزید تمیمی معروف بہ ریاحی کے زیر دست ایک ہزار سوار پر مشتمل تھا۔ آفتاب نصف النہار پر تھا اور گرمی انتہا کی شدت پر تھی۔ پیاس کی وجہ سے انسان اور حیوان دونوں حالتِ سوز و گداز میں تھے۔ سب سے پہلے امام حلیم و شہید علی الاطلاق نے جو ساقیٔ کوثر کا فرزند دلبند تھا اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ ان ہزار سواروں کو مع ان کے گھوڑوں کے سیراب کریں۔ اس گروہ نے بانتہائے بے حیائی فرزند رسول اللہ کی اس جوانمردی کا صلہ کربلا پہنچتے ہی دل کھول کر دیا یعنی کربلا میں پہنچ کر ابن زیاد کے حکم سے امام حسین علیہ السلام اور اہل بیت نبوت پر پانی بند کر دیا جو بجز اہل بیت نبوت سب پر مباح تھا۔

بودند دام و دد ہمہ سیراب و می مکید
خاتم ز قحط آب سلیمان کربلا

لیکن یہ نکتہ یاد رہے۔ کہ امام حسینؑ اس جوانمردی کے عوض کسی پاداش یا صلے کے منتظر نہ تھے۔ بلکہ امام زماں ہونے کی حیثیت سے بنظر عظمت و بلندیٔ مقام و نجابت خانوادگی وظیفۂ مروت و دوستی انجام دے رہے تھے۔ جب دستۂ مقابل کے سوار اور ان کے حیوانات سیراب ہو گئے اور ان کے ہوش ٹھکانے آئے تو امام حسینؑ نے حرّ ریاحی سے پوچھا "آیا تم ہماری مدد کے لئے آئے ہو یا ہمارے خلاف ہو"۔ حرّ نے جواب دیا "اے اباعبداللہ۔ ہم لوگ آپ کے خلاف آئے ہیں"

امام حسینؑ نے جب یہ سنا تو کلمۂ حول پڑھا اور پھر اس سے کچھ نہ پوچھا۔ نماز ظہر کا وقت ہوا تو امام حسینؑ نے حجاج بن مسروق کو اذان کہنے کا حکم دیا۔ اور نماز کے لئے تیار ہوئے۔ پھر حضرت خیمے سے باہر تشریف لائے اور مخالفین کے سامنے کھڑے ہو کر بعد از حمد و سپاس خدا فرمایا۔

"اے لوگو! میں خود اپنی مرضی سے تمہارے پاس نہیں آیا۔ تم نے پے در پے مجھ کو خط بھیجے۔ تمہارے نمائندے میرے پاس آئے۔ ان خطوں میں اور ان نمائندوں کی زبانی تم نے مجھ سے درخواست کی "کہ ہمارا کوئی امام و پیشوا نہیں آپ ہمارے پاس آئیں تاکہ آپ کے وسیلے سے خداوند ہم کو حق پر برقرار رکھے اور سیدھا راستہ دکھائے۔ پس جو کچھ تم نے لکھا تھا اگر وہ صحیح ہے۔ تو تم اپنے

قول پر قائم ہو تو میں اب تمہارے پاس آگیا ہوں۔ اسی بنا پر تم مجھ سے عہد و میثاق کرو۔ اور اگر ایسا نہیں کرتے اور میرے یہاں آنے سے بیزار ہو۔ تو تو میں جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس چلا جاؤں گا۔" مخالفین میں سے کسی نے جواب نہ دیا۔ امام علیہ السلام نے مؤذن کو اقامہ نماز کے لیے حکم دیا۔ اس کے بعد حُر کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "کیا تمہاری خواہش یہ ہے۔ کہ اپنے ہمراہیوں کے پیش نماز بنو"۔ حُر نے جواب دیا۔ "نہیں، بہتر یہی ہے۔ کہ ہم آپ کی اقتدا کریں"۔ پس تمام مخالفین نے نماز ظہر امام حسین علیہ السلام کے پیچھے پڑھی۔ نماز سے فارغ ہو کر امام علیہ السلام اپنے یاروں سے ملے اور پھر اپنے خیموں میں آگئے۔ حُر بھی اپنے خیمے کی طرف لوٹا جو اس کے لئے از حیثیت رئیس دستہ سواراں علیحدہ نصب کیا گیا تھا اور باقی سواروں نے گھوڑوں کی لگامیں پکڑیں اور آرام کی خاطر ان کے سائے میں بیٹھ گئے۔
نماز عصر کے وقت بھی مؤذن امام حسین علیہ السلام نے اذان اور اقامہ نماز کی خدمت انجام دی اور امام حسینؑ نے دونوں گروہوں کو نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد آنحضرتؑ دونوں گروہوں کے درمیان کھڑے ہوئے اور بعد از حمد و ثنائے خدا تعالیٰ فرمایا۔

"اما بعد۔ اے لوگو۔ اگر تم خدا سے ڈرو اور حق کو صاحب حق کے سپرد کرو تو خدا تعالیٰ تم سے خوشنود و راضی ہوگا۔ ہم خاندان پیغمبر اکرمؐ اور اس کی اولاد سے ہیں اور ولائیت کے لئے شائستہ تر و سزاوار تر ہیں اُن لوگوں کی نسبت جو تم پر حکومت کر رہے ہیں۔ اور وہ ایسے مقام کے مدعی ہیں جس کے وہ لائق نہیں ہیں۔ اور اس نالائقی کے باوجود تم لوگوں کو اپنی قوت قاہرہ دکھاتے ہیں اور عدالت نہیں کرتے۔ اگر تم لوگ ہم سے بیزار ہو اور ہمارے حق سے انکار کرنے پر اصرار کرتے ہو اور تمہاری رائے، تمہارا عقیدہ اب وہ نہ رہا ہو جو تم نے اپنے خطوں میں ظاہر کیا تھا اور تمہارے فرستادگان نے تمہاری طرف سے مجھے زبانی بتایا تھا تو میں یہیں سے واپس چلا جاتا ہوں۔ اور میرا تمہارے ساتھ کوئی کام نہیں"۔ حُر نے جواب دیا۔ "بخدا ان خطوں اور نمائندوں سے جن کا آپ ذکر کر رہے ہیں۔ ہم بالکل بے اطلاع ہیں۔ امام حسینؑ نے اپنے یاروں میں سے عقبۃ بن سمعان کو فرمایا۔ "وہ دو خرجینیں جن میں یہ خطوط ہیں لے آؤ"۔ عقبۃ وہ دو خرجینیں جو اہل کوفہ و عراق کے خطوں سے بھری ہوئی تھیں اٹھا لایا اور تمام خطوط امام حسینؑ اور حُر ریاحی کے درمیان زمین پر بکھیر دیئے گئے۔ حُر ریاحی نے عرض کی۔ "ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ جنہوں نے یہ تمام خطوط حضرت کی خدمت میں بھیجے۔ ہم تو وہ ہیں جن کو حکم دیا گیا ہے کہ راستے میں جہاں کہیں آپ کو ہم ملیں ہم آپ کے ساتھ رہیں۔ اور آپ کو کوفے میں ابن زیاد کے پاس لے جائیں۔" امام حسین علیہ السلام نے فرمایا۔ "یہ غیر ممکن ہے اور موت تیرے لیے اس آرزو سے عملی تر ہے۔" امام حسینؑ نے اپنے یاروں کو حکم دیا۔ "سوار ہو جاؤ"۔ وہ سوار ہو گئے اور خود امام علیہ السلام عورتوں

اور بچوں کو سوار کرنے میں مراقب رہیے۔ اس کے بعد حضرت نے یاروں کو حکم دیا "چلو واپس چلیں"
۵ پند حکیم محض صواب است و عین خیر ☆ فرخندہ بخت آنکہ بسمع رضا شنید (حافظؒ)
یہ واپسی کا حکم اتمام حجت کے لئے تھا ورنہ امام علیم تھے۔ آنحضرت علیہ السلام دین مبین اسلام کے تحفظ کی خاطر راہ حق میں شہید ہونے کیلئے مدینے سے کربلا آ رہے تھے۔ یہ مشیت الٰہی تھی کہ جس کو روکنا ناممکن تھا پس آنحضرت علیہ السلام کا مقصود یہ تھا کہ حضرت کی شہادت کے بعد دنیائے اسلام خود فیصلہ کرے کہ جب امام حسینؑ مع اہل بیت نبوت بجائے کوفہ کی طرف بڑھنے کے مدینے کو واپس لوٹنے کے لئے آمادہ ہو گئے تھے تو آنحضرتؑ کو واپس جانے سے کیوں روکا گیا؟۔ کیا یہ صریح ظلم نہ تھا؟ اس اتمام حجت اور اسی قبیل کی دوسری پیش آمدگیوں نے دوران ایام عاشورہ یاران و انصار امام حسینؑ کو اور صبح روز عاشورہ حرؑ بن یزید ریاحی کو فوق العادہ متاثر کیا اور سب نے مظلومیت امام حسین علیہ السلام اور اہل بیت رسول اللہ سے متاثر ہو کر آنحضرت پر پروانہ وار اپنی جانیں قربان کر دیں۔ علیہم السلام

جب امام علیہ السلام واپس جانے لگے تو حرؑ ریاحی اور اس کے سوار مانع آئے اور راستہ روک لیا۔ امام حسین علیہ السلام نے حرؑ سے خطاب ہو کر فرمایا "تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے۔ تو کیا اقدام کرنا چاہتا ہے۔" حرؑ پر یہ عتاب امامؑ اور وہ بھی ایک ہزار سواروں کے سامنے جو حرؑ کے زیردست تھے کچھ ناگوار گذرا۔ مگر یہ عتاب کرنیوالا کون تھا۔ حسینؑ ابن علیؑ فرزند دختر خاتم النبیین حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا شریف ترین زنان عرب و السلام۔ حرؑ نے عرض کی "اگر یہ کلمہ اعراب میں سے کسی اور کے منہ سے نکلتا اور وہ اس حالت میں ہوتا جس میں کہ آپ اس وقت ہیں۔ (یعنی ہمارے ہاتھوں میں اسیر ہیں) تو میں یہ کلمہ عیناً اس کو واپس کرتا اور خواہ وہ کسی درجے کا ہوتا میں اس کی ماں کا نام ضرور لیتا۔ لیکن آپ کی ماں کے بارے میں میرے لئے کوئی علاج نہیں سوائے اس کے کہ اس کا نام بہترین عبارات اور کمال احترام کے ساتھ لوں"۔ امام حسین علیہ السلام نے نرمی سے پوچھا "تو پھر ہم سے کیا چاہتا ہے۔ اور تیرے منظور نظر کیا ہے۔" حرؑ نے عرض کی "میں چاہتا ہوں کہ آپ کو ابن زیاد کے پاس کوفے میں پہنچاؤں"۔ امام حسینؑ نے فرمایا "بخدا میں اس صورت میں تیرے ہمراہ نہیں ہوں"۔ حرؑ نے عرض کی "بخدا میں بھی آپ سے دست بردار نہیں ہوں گا"۔ یہی کلمات کئی مرتبہ آپس میں رد و بدل ہوتے رہے اور طرفین اپنے اپنے قول پر مصر تھے۔ آخر حرؑ نے عرض کی "میں آپ سے جنگ کرنے پر مامور نہیں ہوں۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ جب تک آپ کو کوفے میں نہ لیجاؤں آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں۔ اب چونکہ آپ میرے ساتھ جانا نہیں چاہتے بہتر یہ ہوگا۔ کہ آپ کوئی ایسا راستہ اختیار کریں جو نہ کوفے کی طرف

جاتا ہو۔ نہ مدینے کی طرف۔ ضمناً میں ابن زیاد کو حقیقت حال سے اطلاع دیتا ہوں۔ شاید خداوند کوئی ایسا وسیلہ بنا دے۔ کہ یہ ماموریت مجھ سے لے لی جائے اور میں آپ کی مخالفت سے آسودہ ہو جاؤں۔" بنابریں امام حسینؑ نے وہ راستہ اختیار کیا جو عذیب و قادسیہ کے درمیان تھا۔ حر بھی آپ کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ چلتے وقت امام علیہ السلام نے پیغمبر اکرمؐ کی حدیثیں ان لوگوں کو سنائیں۔ بنی امیہ ان کے افعال و کردار ظالم اور عدم لیاقت و شائستگی برائے مقام شامخ خلافت الٰہیہ پر روشنی ڈالی اور پھر انہی خطوط کا ذکر کیا جو عراقیوں اور کوفیوں نے آنحضرت کی خدمت میں بھیجے تھے۔ اس کے بعد فرمایا میں "فرزند فاطمہؑ دختر پیغمبر اکرمؐ ہوں۔ میری پیروی کرو۔" حر نے عرض کی "میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ اپنی جان کی حفاظت کریں۔ میں بطور قطعی جانتا ہوں کہ اگر آپ لڑے تو آپ مارے جائیں گے۔ (کیونکہ دشمن آپ سے قوی تر ہے اور آپ اس عدۂ قلیل کے ساتھ جو آپ کے ہمراہ ہے دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔) امام علیہ السلام نے فرمایا۔ "کیا تو مجھے موت سے ڈراتا ہے۔ کیا نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی۔ کہ یہ لوگ مجھے مار ڈالیں"!

(اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ نبیؐ و امامؑ کے وجود میں موت نہیں بلکہ موت عالم خلق و زمانیات سے متعلق ہے۔ نبیؐ و امامؑ عالم امری سے ہیں۔ اور کلمتہ اللہ ہیں اور کلمتہ اللہ فانی نہیں باقی ہے۔ پس عالم امری سے تعلق رکھنے والے تابع موت نہیں۔ متبوع موت ہیں۔ یعنی موت انکے تابع ہے۔ پیغمبر اکرمؐ و آئمہ ہدیٰ علیہم السلام امت وسطیٰ ہیں اور اعتدال حقیقی رکھتے ہیں اور جب تک کوئی خارجی حادثہ یا صدمہ پیش نہ آئے مثل زہر، قتل وغیرہ نہیں مرتے اور زہر و قتل وغیرہ کی صورت میں بھی جب تک نبیؐ یا امامؑ کا ارادہ نہ ہو ملک الموت ان کی روح قبض نہیں کر سکتا کیونکہ وہ ملک الموت سے افضل اور ان کی قوت عزرائیل کی قوت سے کہیں زیادہ ہے۔ ہاں جب نبیؐ و امامؑ موت کا ارادہ کرلیں تو ملک الموت ان کی اجازت سے انکی روح قبض کرتا ہے۔ لیکن اس صورت میں بھی نبیؐ و امامؑ کی موت مثل مرگ عالم خلقی نہیں کہ مرنے کے بعد اجزائے عنصری و مادی متفرق و متلاشی ہو کر اپنے اپنے اجزا سے جا ملیں اور اجسام فنا ہو جائیں۔ تفرق اجزائے جسم و فنا عالم خلقی سے مخصوص ہے۔ عالم امری والوں کی موت عبارت ہے ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف ایک نشاء سے دوسرے نشاء کی طرف عیناً منتقل ہو جانا اور بس! انبیاء و آئمہ ہدیٰ علیہم السلام زندہ جاوید ہیں۔ کیونکہ سب کلمتہ وجودیہ الٰہیہ ہیں! اسی حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے امام حسین علیہ السلام نے فرمایا۔ "کیا تو مجھے موت سے ڈراتا ہے۔" یعنی موت تو خود ہمارے ارادے کے تابع ہے۔ ہم کیوں موت سے ڈرنے لگے) حر نے جب امام علیہ السلام کو اس حال میں دیکھا تو خاموش ہو گیا۔

(۱۰) **غذیب الهجانات** ۔ سفر کرتے کرتے امام حسین علیہ السلام غذیب کے مقام پر پہنچے۔
اس جگہ چار شخص (۱) عمرو بن خالد صیداوی ۔ (۲و۳) مجمع بن عائذ مع فرزند (۴) جنادہ بن
حارث سلمانی جو امام حسینؑ کی نصرت و یاری کے لئے کوفے سے آئے تھے امامؑ کی خدمت میں شرفیاب
ہوئے ۔ چونکہ راستے بند تھے یہ لوگ راہ سے بے راہ چکر کاٹتے ، دشمن کی مراقبت سے بچتے طرماح
بن عدی طائی کی معیت میں بڑی زحمت سے یہاں آ پہنچے ۔ حرؑ نے چاہا کہ ان کو توقیف کر کے کوفے واپس
بھیجے لیکن ، امام علیہ السلام مانع آئے ۔ آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ میری مدد کے لئے آئے ہیں اور میرے
پیرو ہیں اور جس طرح کہ میں اپنی جان کی حفاظت کر رہا ہوں ان کی جان کی حفاظت بھی میرے ذمے
ہے پس اگر تم میرے ساتھ پہلے جیسا ہی سلوک کرتے ہو اور میرے یاروں میں سے کسی کے متعرض نہ ہو تو
ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہیں بصورت دیگر میں تمہارے ساتھ جنگ کروں گا ۔ حرؑ کو جنگ کی کوئی
اجازت نہ تھی ۔ پس وہ اپنے ارادے سے باز رہا اور کوفے سے آنے والوں کا متعرض نہ ہوا ۔

امام علیہ السلام نے ان یاروں سے کوفے کے حالات دریافت کئے ، چونکہ یہ لوگ جریان وقائع
و آخرین اخبار کوفے سے کاملاً آگاہ تھے ۔ انہوں نے عرض کی کہ ہمارے بزرگوں کو ابن زیاد نے رشوہ و سیم و
زر دے کر اپنی طرف متمائل کر لیا ہے اور اب یہ بزرگان قوم آپ کے مخالف ہو گئے ہیں ۔ رہے عوام
وہ اگرچہ قلباً آپ کے ساتھ ہیں لیکن ان کی شمشیریں آپ کے خون کی پیاسی ہیں ۔

احیان الشیعہ (جزو چہارم ص ۱۹۴) میں منقول ہے ۔ کہ طرماح بن عدی نے امام حسینؑ کی خدمت
میں عرض کی " کہ میں خدا کے نام سے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اپنی جان کی حفاظت کریں
اور اہل کوفہ کے قول و گفتار پر اعتماد نہ کریں ۔ بخدا اگر آپ کوفہ میں وارد ہوئے تو قتل کئے جاؤ گے ۔ بلکہ
مجھے تو ڈر ہے کہ آپ کوفے تک بھی نہ پہنچ سکیں گے اور آپ کے ساتھ کوئی اتنی بڑی جمعیت بھی
نہیں جو اس جمعیت سے مقابلے کے لئے تو یہی عدہ (حرؑ ریاحی اور اس کے سوار) کافی ہے ۔ کوفے
سے خارج ہوتے وقت میں نے دیکھا تھا کہ ایک بھاری جمعیت آپ کی دشمن ہے پس میں آپ کو
خدا کی قسم دیتا ہوں ۔ کہ اگر ہو سکے تو ایک بالشت بھر بھی کوفے کی طرف نہ بڑھیں " اس کے
بعد طرماح نے امام علیہ السلام سے خواہش کی کہ " آپ میرے ساتھ چلیں اور اس پہاڑی میں توقف کریں
جو قبیلہ طے کی سکونتی سرزمینوں میں واقع ہے اور میں آپ کو قول شرف دیتا ہوں کہ قبیلہ طے
میں سے بیست ہزار (۲۰۰۰۰) نفر شمشیر زن آپ کے ملتزم رکاب کر دوں گا " ۔ امام حسینؑ نے
طرماح کے حق میں دعائے خیر کی اور فرمایا ۔ " میں تمہارے ساتھ چلنے سے معذور ہوں ۔ میں نے
ان لوگوں (اہل کوفہ) سے وعدہ کیا ہوا ہے ۔ اور میں اپنے قول سے انحراف نہیں کر سکتا ۔ میں ضرور
جاؤں گا ۔ اگر خداوند تعالےٰ نے اس مصیبت کو ہم سے دور کر دیا تو یہ اس کا شیوہ و کرم دیرینہ ہے

اور اگر میں مارا گیا تو میں شہادت کے درجے پر فائز ہوں گا۔" طرماح نے عرض کی کہ "میں یہ غلہ و اسباب جو میرے پاس ہے اپنے گھر پہنچا کر حضرت کی خدمت میں واپس آؤں گا۔" طرماح نے اپنا وعدہ پورا کیا اور واپس آیا۔ لیکن ابھی کربلا تک پہنچنے میں چند منزلیں باقی تھیں کہ اسے معلوم ہوا امام حسین علیہ السلام شہید کر دیئے گئے ہیں۔

(۱۱) **قصر بنی مقاتل** ۔ عذیب سے کوچ کرکے قافلہ اہل بیت نبوت رات کے وقت (قصر بنی مقاتل) میں پہنچا۔ اور قدرے توقف و آرام کے بعد پانی کی زیادہ مقدار اپنے ساتھ لے کر رات کے آخری حصے میں پھر چل پڑا۔ عقبہ بن سمعان راوی ہے کہ ہم جا رہے تھے۔ کوئی ایک گھنٹہ کے بعد امام حسینؑ کو سواری کی حالت میں ایک اونگھ سی آگئی لیکن جلدی ہی حضرت لاحول پڑھتے ہوئے بیدار ہو گئے۔ حضرت کے فرزند علی اکبر نے اس کا سبب پوچھا تو آنحضرت نے فرمایا۔ ابھی میری آنکھ لگی تھی کہ میں نے ایک سوار کو دیکھا جس نے ہمارے پاس سے گزرتے ہوئے کہا کہ یہ گروہ مرگ کی طرف جا رہا ہے۔

علی اکبر نے پوچھا۔ "کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟" امام حسینؑ نے فرمایا۔ "اس خدا کی قسم جس کی طرف تمام مخلوق کی بازگشت ہے ہم حق پر ہیں۔" علی بن الحسینؑ نے کہا۔ "تو اس صورت میں ہم موت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔" غرض اس طرح سفر کرتے ہوئے یہ قافلہ نینوا کی سرزمین میں داخل ہو گیا۔

(باقی آئندہ)

SHIA CULTURE IN HOLY QURAN

قرآنی اصطلاحات! شیعیت سے متعلق چند قرآنی تفاسیر و عقائد

"شیعہ کلچر قرآن کی روشنی میں" (قسط اول)

از قلم: سید جواد حسین شاہ نقوی اسلامک ریسرچ سنٹر بھکر ضلع میانوالی

قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت کا شاہکار اس کی اصطلاحات ہیں۔ اس کتاب محکم کی یہ اصطلاحات اپنے اندر ہزاروں مطالب سموئے ہوئے ہوتی ہیں۔ ان ہی اصطلاحوں میں حضرت ابراہیم کے متعلق لفظ "شیعہ" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا گیا لیکن وہ لوگ جو قرآنی اصطلاحات کے وسیع مفہوم سے ناآشنا ہیں۔ انہوں نے اس اصطلاح کو محدود بنا لیا۔ لیکن ایک وسیع النظر انسان ہمیشہ قرآن کے وسیع مفہوم پر نگاہ رکھے گا۔ اور ایک نکتہ سنج انسان اس سے کما حقہٗ فائدہ اٹھا سکے گا۔ قرآن کریم ہی وہ پہلی کتاب ہے جس نے علم تاریخ کو بالکل جدید نقطۂ نظر (SCIENCE OF HISTORY) کے طور پر لیا۔ اس لئے اس کی اصطلاح میں لفظ "شیعہ" میں ایک کلچر پوشیدہ ہے جس کے اعلیٰ اصولوں کو قرآن کریم نے بار بار دہرایا ہے۔ یاد رہے کہ قرآنی نقطۂ نظر سے عقائد کی دنیا تمدن و کلچر سے الگ نہیں بلکہ ساتھ ساتھ ہے۔ لہٰذا ہم شیعہ کلچر اور مادی کلچر کا ذرا سا فرق واضح کرتے جائیں تاکہ اس کو مطالعہ کرنے کے بعد کسی آخری نتیجہ پر پہنچا جا سکے۔

اسی مطالعہ کے دوران میں استخلاف فی الارض کا بیش بہا قانون ملتا ہے۔ جو امامت کیلئے طغرائے امتیاز ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم کو جب منصب امامت سونپا جاتا ہے۔ تو اس میں "صلاحیت" اور "صالحیت" دو مباحث قائم ہو جاتے ہیں۔ اور اس کلچر میں صالحیت کو مقام دیا جاتا ہے۔ اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے ہمیں تھوڑی دور جانا پڑے گا۔

(۱) ایک شخص سنکھیا کھا لیتا ہے۔ اس کی ہلاکت یقینی ہے۔ اس لئے کہ انسان کی طبعی زندگی ایک خاص نظام اور خاص قوانین کے مطابق چل رہی ہے۔ اس نظام اور ان قوانین طبعی نے سنکھیے کو مہلک بنایا ہے۔ اس لئے کہ یہ انسانی جسم پر ایک ایسا اثر مرتب کرتا ہے۔ جو قاطع زندگی ہے۔ اس لئے سنکھیا کھانے والے کی موت یقینی ہے۔ یہ قوانین فطرت کا تقاضا ہے اور اس کا ثبوت بدیہی

(۲) ایک شخص گھی کھاتا ہے۔ اور گھی ممد حیات ہے۔ اس لئے اس سے اس میں توانائی پیدا

ہوتی ہے اور توانائی سے زندگی کا قیام ہے۔

(۳) ایک شخص گھی خرید کر لاتا ہے۔ دوسرا شخص چرا کر لاتا ہے۔ سوال یہ ہے۔ کہ ان دونوں پر گھی کا اثر یکساں ہوگا۔ یا مختلف قوانین طبعی کا۔ جواب صاف اور واضح ہے۔ کہ گھی کے اثر پر اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ گھی دونوں صورتوں میں توانائی بخش اور ممد حیات ثابت ہوگا۔ اس سے ہر حالت میں زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

(۴) مغرب کی مادی اور میکانکی تہذیب چونکہ قوانین طبعی سے ماوراء کسی اور نظام قوانین کو تسلیم نہیں کرتی اس لئے اس کے نزدیک جو شئے ممد حیات اور تقویت بخش ہے۔ فائدہ رساں ہے۔ اور چونکہ کسی شے کے اچھے یا برے ہونے کا معیار لامحالہ یہی ہے۔ کہ وہ نفع رساں ہے۔ یا نقصان دہ۔ اس کے ذریعہ حصول میں اس فیصلہ کو کوئی دخل نہیں۔ گھی اچھی چیز ہے۔ خواہ وہ کسی طریق سے حاصل کیا جائے۔

(۵) عام طور پر کہا جاتا ہے۔ کہ اہل مغرب جب چوری کو معیوب قرار دیتے ہیں۔ اور قانون کی رو سے جرم تو لامحالہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ کہ چوری کا گھی، بری چیز ہے اور خریدا ہوا گھی، اچھی چیز۔

لیکن ہم نے ابھی اوپر لکھا ہے۔ کہ قوانین طبعی کی رو سے گھی کا اثر ایک ہی ہوتا ہے خواہ وہ مسروقہ ہو۔ یا خرید کردہ۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے۔ کہ مادی تہذیب کی رو سے چوری کا گھی اور نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ اور خرید کردہ اور۔ لہٰذا بات زیادہ سے زیادہ یوں ہوئی کہ (ا) گھی بہر حال اچھی چیز ہے۔ (ب) چوری بری چیز ہے۔ شق (ب) یعنی چوری بری چیز ہے۔ قوانین طبعی سے متعلق نہیں۔ ضابطہ اخلاق سے متعلق ہے۔ لیکن جب انسان کی زندگی صرف قوانین طبعی کے ماتحت ہے۔ تو پھر یہ ضابطہ اخلاق کیا ہے۔ اسلم چوری، ڈاکہ، دھوکہ، فریب سے روپیہ حاصل کرتا ہے۔ اس سے اسلحہ خریدتا ہے اپنے گرد ایک جماعت پیدا کر لیتا ہے۔ خود بھی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے متوسلین کو بھی آسائش و راحت کے سامان فراہم کر دیتا ہے۔ دوسری طرف عمر، صبح سے شام تک محنت کرتا ہے۔ بڑی مشکل سے چار پیسے حاصل کرتا ہے۔ عمر بھر حسرت سے دن گزارتا ہے۔ زندگی بڑی تنگی سے گزارتا ہے۔ اسلم بھی مر جاتا۔ عمر بھی۔ دونوں کا معاملہ قوانین طبعی کی رو سے ختم ہو جاتا ہے۔ ضابطہ اخلاق کی پابندی نے عمر کو کیا دیا اور اس کی شکست و ریخت نے اسلم کا کیا بگاڑا۔ لہٰذا ضابطہ اخلاق سے فائدہ کیا ہے؟ مغرب کا معلم اخلاق یہ جواب دیتا ہے۔ کہ ضابطہ اخلاق سے سوسائٹی کا نظام قائم رہتا ہے یعنی ہربرٹ اسپنسر کے الفاظ میں اخلاق، خوف انتقام کی پیدا کردہ چیز ہے۔ یعنی میں چوری اس

لئے نہیں کرتا کہ ڈرتا ہوں۔ کہ اگر اسے معیوب نہ قرار دیا گیا۔ تو میری بھی کوئی چیز محفوظ نہ رہ سکے گی۔ میں کسی کو فریب اس لئے نہیں دیتا۔ کہ مجھے خوف ہے۔ کہ اگر اس پر پابندی نہ لگائی گئی۔ تو مجھ سے زیادہ شاطر و عیار مجھے فریب دے جائے گا۔ لہٰذا اخلاقیات کی ذاتی طور پر کچھ قیمت نہیں۔ یہ نظام سوسائٹی کو قائم رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اور اس کی بنیاد، خوف انتقام اور پولیس، عدالت، جیل سب اسی جذبۂ خوف کو برقرار رکھنے کے ذرائع۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر میں ایسا انتظام کر لوں کہ مجھے خوف انتقام نہ رہے۔ یعنی میں کسی پولیس والے کے قابو نہ آسکوں اور اگر قابو آ بھی جاؤں تو عدالت پر اثر ڈال لوں۔ یا اتنی طاقت حاصل کر لوں۔ کہ کسی دوسرے کو مجھ سے یا راۓ انتقام ہی نہ رہے[1]۔ تو پھر میرے لئے اخلاق کی پابندی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ہر انسان اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے۔ کہ اب یورپ میں کیا ہو رہا ہے۔ وہاں اب ذہنوں کی جنگ ہے۔ ہر شخص یہ کوشش کرتا ہے۔ کہ میں ایسا انتظام کر لوں کہ دوسرے کو دھوکا دے جاؤں۔ لیکن اسے پتہ نہ چلے۔ جرم کر جاؤں لیکن پکڑا نہ جاؤں۔

لیکن اس صورت میں پھر بھی جرم کا احساس باقی رہتا ہے۔ اس کے لئے ذرا آگے بڑھو۔ اگر کوئی سوسائٹی یہ فیصلہ کر دے۔ کہ اپنے قبیلہ یا اپنی قوم میں چوری کرنا، فریب دینا جرم ہے۔ لیکن دوسرے قبیلہ یا دوسری قوم کے ساتھ یہ سب کچھ روا ہے۔ تو پھر ان اعمال میں جرم کا احساس بھی نہیں رہے گا۔ قدیم زمانے میں رومی لوگ اسی پر عامل تھے اور ان کے نزدیک دوسری اقوام کے ہاں چوری کرنا کچھ معیوب نہ تھا۔ اس کی تقلید یورپ کے نیشلزم نے کی ہے۔ ہر وہ کام جس سے اپنی نیشن کو تقویت پہنچتی ہے۔ حب الوطنی کا جوہر قرار دیا جاتا ہے۔ لہٰذا در خور ستائش۔ اب وہی جنگ عقول جو ایک قوم کے افراد میں باہمد گر تھی۔ مختلف اقوام عالم میں سرگرم عمل ہے۔ اب ہر قوم دوسری اقوام کو ہڑپ کر جانے کی فکر میں رہتی ہے۔ کرنا اسکو فقط اتنا ہوتا ہے۔ کہ اتنی قوت فراہم کر لے کہ اسے خوف انتقام نہ رہے۔ اسی کا نام اُن کے ہاں صلاحیت ہے۔ یعنی اُن کے نزدیک زندہ رہنے کی صلاحیت اس قوم میں ہے جو خوف انتقام سے مامون ہو جائے۔ اور پھر جو کچھ جی میں آئے۔ کرے۔ یہ مادی تعلیم کا ماحصل اور یہ مفہوم ہے۔ صلاحیت کا۔ یعنی قوی ہر حال توانائی بخش ہے۔ خواہ وہ خرید کر لو۔ اور خواہ چرا کر ——— ؟؟؟

[1] یا جمہوریت کے اکثر ووٹ اپنے حق میں حاصل کرنے کے اقتدار سنبھال کر ناجائز طریقوں پر عمل کی ناشروع کر دو (معارف اسلام)

یہ ایک نہج فکر ہے۔ دوسری طرف ایک اور اسلوب فکر ہے۔ جس کی دعوت اس بنیاد پر ہے کہ انسان کی طبعی زندگی، طبعی قوانین کے تابع ہے۔ لیکن زندگی صرفِ طبعی ہی نہیں۔ اس سے آگے کچھ اور بھی ہے۔ طبعی زندگی حیوان اور انسان دونوں میں مشترک ہے۔ لیکن مقامِ انسانیت سطح حیوانیت سے ایک درجہ آگے ہے۔ انسانی زندگی کی اس خصوصیت کا نام کچھ ہی رکھ لیجئے۔ غرض نام سے نہیں اس حقیقت سے ہے۔ جس کا تعارف اس نام سے کرایا جائے۔ مقامِ انسانیت کی یہ وہ امتیازی خصوصیت ہے۔ جو قوانین طبعی کے تابع نہیں ہے۔ اس لئے اس کا سلسلہ بھی سانس کی آمد و رفت تک محدود نہیں تار نفس کے ٹوٹنے کے بعد یہ رشتہ قائم رہتا ہے۔ جسے آئمہ اہلبیتؑ کی اصطلاح میں "شرف انسانیت" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور حضرت علیؑ کی نظر میں یہی چیز انسان —— اور فرشتہ میں مابہ الامتیاز ہے۔ جس طرح انسان کے جسمانی قوتی کی پرورش و تعمیر ایک خاص نظام کے ماتحت ہوتی ہے۔ اسی طرح سے اس شے دیگر شرف انسانیت یا خودی کی تربیت و پختگی بھی ایک خاص ضابطہ آئین کے تابع ہوتی ہے۔ اس امتیاز کے ماتحت "گھی" اور "مسروقہ" دو الگ الگ چیزیں ہو جاتی ہیں۔ گھی اپنا نتیجہ قانون طبعی کے مطابق مرتب کرتا ہے۔ مسروقہ اپنا نتیجہ اس دوسرے قانون کی رو سے مشکل کرتا ہے۔ اس قانون کو قانون مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ جو جہان مشیت سے متعلق ہے۔ خدا کی ذات ان دونوں نظامہائے قوانین (قوانین فطرت اور قوانین مشیت سے متعلق ہے۔) کی نگران ہے۔ چنانچہ جہاں اس کا قانون فطرت یہ دیکھتا ہے۔ کہ گھی کا نتیجہ جسم انسانی کے لئے قوت بخش ہونا چاہیئے۔ وہاں اس کا قانون مکافات اس پر بھی نگاہ رکھتا ہے کہ مسروقہ کا نتیجہ زوال شرف انسانیت ہے۔ یا ضعفِ خودی ہونا چاہیئے۔ اور چونکہ یہ ضوابط قوانین اٹل ہیں۔ اس لئے ان کے نتائج بھی اٹل ہیں۔ قوانین فطرت کے مطابق عمدہ نتائج کا ماحصل صلاحیت ہے۔ اور قانون مکافات کے مطابق عمل خیر کا ماحصل صالحیت۔ قرآن ان دونوں ضوابط قوانین کی نگہداشت کا حکم دیتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے۔ کہ اس کی صالحیت میں صلاحیت بھی خود بخود آجاتی ہے۔ لیکن فکر مغرب کی صلاحیت میں صالحیت نہیں آتی !!!

اور یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ اس صالحیت سے نظام سوسائٹی خود بخود صحیح خطوط پر قائم رہے گا۔ لہٰذا وہ ضابطہ اخلاق جسے معلمین اخلاق نے نظام سوسائٹی اور کلچرل سوسائٹی کا معیار اختیار کیا تھا۔ اس نظام مکافات عمل کا ایک طبعی نتیجہ ہو گیا۔ مقصود بالذات نہ رہا۔ قرآن کا نظام انسانی معاشرہ کو بھی صحیح خطوط پر قائم رکھتا ہے۔ اور انسانی خودی کو ارتقائے

شرفِ انسانیت کی منازل طے کرتا ہوا اِس زندگی سے ارفع و اعلیٰ زندگی بسر کرنے کی صلاحیت بھی عطا کرتا ہے۔ لہٰذا نظامِ سوسائٹی کا قیام اِس سفر میں سنگِ میل یا چراغِ راہ بن کر رہ جاتا ہے منزلِ مقصود اِس سے کہیں آگے ہوتی ہے۔ یعنی اِس تجارت عظمیٰ کا محض (By Product) ہوتا ہے۔

سوسائٹی کا نظام ہر ایسے ضابطہ کی رُو سے چل سکتا ہے۔ جسے افراد سوسائٹی متفقہ طور پر تسلیم کرلیں۔ اِس لیے اِس نظام کو چلانے والے ضابطہ کی کوئی مستقل قدر نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر کوئی سوسائٹی متفقہ طور پہ یہ تسلیم کرے۔ کہ مرد اور عورت کے تعلقات کے لیے مناکحت کی ضرورت نہیں۔ یہ خالص طبیعی جذبہ ہے۔ جس کی تسکین باہمی رضامندی سے ہر جگہ کی جاسکتی ہے۔ باقی رہے اِس تسکین جذبات کے نتائج (یعنی اولاد) تو اِن کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا انتظام خود سوسائٹی کی طرف سے ہو جائے گا۔ تو ظاہر ہے کہ اِس سوسائٹی کا یہ نظام بھی چل جائے گا۔ اِس صورت میں اِس سوسائٹی کے ضابطہ اخلاق میں زنا کا لفظ تک بھی باقی نہیں رہے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ محض نظام سوسائٹی کو برقرار رکھنے کے لیے جو ضابطہ اخلاق مرتب کیا جائے گا۔ اس کی ذاتی حیثیت کچھ نہیں ہوگی۔ اگر ایک وقت میں مناکحت اخلاق حسنہ کا جزو قرار پائے گی۔ تو دوسرے وقت میں بے باکانہ تسکین جذبات بھی حیثیت اختیار کرے گی۔ مثال کے طور پر آج دنیا کے اقتصادیات میں ربوٰا (سود) کو نظام سوسائٹی نے متفقہ طور پر جائز تسلیم کرلیا ہے۔ لہٰذا یہ اُن کے ضابطہ اخلاق کی رُو سے معیوب ہے نہ کسی قانون کی رُو سے جرم۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ فکرِ مغرب کی رُو سے ربوا (سود) فی ذاتہ معیوب ہے نہ مستحسن۔ اگر سوسائٹی اپنے نظام کے قیام کے لیے اِسے متفقہ طور پہ معیوب قرار دے دے۔ تو یہ معیوب ہو جائے گا۔ اور اگر متفقہ طور پر اسے اختیار کرلے۔ تو یہ مستحسن قرار پائے گا۔ (جس طرح یورپ میں بائیں طرف چلنا قانون راہ روی ہے۔ اور امریکہ میں دائیں طرف چلنا) لہٰذا مغربی نہج فکر کے ضوابطِ اخلاق کے اجزاء اپنی مستقل حیثیت کچھ نہیں رکھتے۔ جس چیز کو معاشرہ متفقہ طور پر اختیار کرلے وہ مستحسن اور جو اس کے خلاف کرے وہ مجرم اور جس شے کو وہ متفقہ طور پر رد کردے وہ معیوب اور اس سے اجتناب کرنے والا شریف۔ لیکن ضابطہ قانون مکافات کی رُو سے ہر چیز اپنی ایک مستقل قدر رکھتی ہے۔ جس طرح عالم طبیعی میں اشیاء کے خواص، انسانوں کے فیصلہ کی رُو سے تبدیل نہیں ہوتے۔ اِسی طرح عالم مشیت (یعنی قانون مکافاتِ عمل) میں بھی اشیاء کے خواص انسانوں کے فیصلوں کی رُو سے نہیں بدلتے۔ مثلاً سنکھیا قاطع حیات

ہے۔ اگر تمام دنیا کے انسان مل کر یہ فیصلہ کر لیں۔ کہ آج سے ہم سنکھیا کو ممد حیات کہیں گے۔ تو اس فیصلہ سے سنکھیا پر کچھ اثر نہ پڑے گا۔ وہ اپنی خاصیت میں اٹل ہے۔ اگر ساری دنیا کے انسان مل کر یہ فیصلہ کر دیں۔ کہ ریا یا جھوٹ کو ممد نظام سوسائٹی قرار دیں گے۔ تو وہ اپنی تاثیر کو نہیں بدلے گا۔ اس لئے کہ اس کا قاطع شرف انسانیت ہونا بھی حق ہے۔ اور حق انسانوں کے فیصلے کے تابع نہیں چلتا۔ پھر جس طرح سنکھیا کو اپنی تاثیر مرتب کرنے کیلئے ایک مستقل نظام طبیعی کی ضرورت ہے۔ جسمانی نظام میں نہ معلوم کیسے کیسے عظیم اور لطیف تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ تب کہیں سنکھیا کی سمت جا کر نتیجہ ہلاکت ہوتی ہے۔ یا کبھی جسمانی توانائی میں تبدیل ہوتا ہے۔ اس طرح جھوٹ کو اپنا ہلاکت انگیز، یا صداقت کو انسانیت پرور، نتیجہ مرتب کرنے کے لئے بھی ایک عظیم الشان نظام کی ضرورت ہے۔ یہ نظام ایسا ہے۔ کہ جس میں نگاہ کی خفیف سی جنبش اور دل کی ہلکی سی لرزش تک بھی بے نتیجہ نہیں رہ سکتی۔ اس حقیقت غیر متبدلہ کا اعتراف اللہ پر ایمان کہلاتا ہے۔ مغرب کے علمائے فطرت، نظام قوانین طبعی کو اٹل مانتے ہیں۔ لیکن وہ اسے بالعموم اندھی فطرت کا میکانکی عمل قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں۔ جو اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ کہ یہ نظام ایک بلند بالا ہستی کا چلایا ہوا ہے۔ اور اس طرح وہ خدا کی ہستی کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن غور کیا جائے کہ آخر خدا پر اس قسم کے ایمان کا کیا نتیجہ ہوتا ہے؟ ایک شخص کہتا ہے۔ کہ چاند، سورج، ستارے سب اتفاقی طور پر گردش کے سلسلہ میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اور میکانکی عمل سے رواں دواں ہیں۔ اور دوسرا شخص کہتا ہے کہ نہیں! انہیں خدا نے بنایا ہے۔ اور یہ اسی کے قائم کردہ نظام کے مطابق سرگرم عمل ہیں۔ کہئے کہ جہاں تک دنیا کے انسانیت کا تعلق ہے۔ اول الذکر کے انکار سے کیا زیاں ہوتا ہے جو ثانی الذکر کے اقرار سے پورا ہو جاتا ہے۔ خدا پر حقیقی ایمان شروع ہی سے اس حقیقت کے اعتراف سے ہوتا ہے۔ کہ اس کے نظام میں کوئی عمل اور کوئی حرکت بلا نتیجہ نہیں رہ سکتی اس لئے قرآن میں متعدد بار آیا ہے۔ ولئن سألتهم من خلق السماوات والارض وسخر الشمس والقمر اگر تو ان سے پوچھے کہ زمین کو کس نے پیدا کیا۔ اور چاند کو کس نے مسخر کر رکھا ہے۔ لیقولن اللہ یہ اقرار کریں گے۔ کہ اللہ نے۔ یعنی وہی ایمان جو مغرب کے علمائے فطرت میں سے خدا کو ماننے والوں کے ہاں ملتا ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے۔ کہ اس اعتراف کے باوجود یہ الٹی الٹی راہیں چلتے ہیں۔ تو یہ اس لئے کہ ان کا ایمان فقط نظام طبیعی کے خالق پر ہوتا ہے۔ قانون مکافات عمل کے خدا پر نہیں ہوتا۔ لہذا مغرب کی میکانکی تہذیب میں۔۔

I۔ یا تو خدا کی ہستی سے کلیتہً انکار ہوتا ہے۔
II۔ اگر کہیں اقرار بھی ہوتا ہے تو فقط نظام طبیعی کے خالق پر۔
III۔ اس کے بعد وہ نظام معاشرت (سوسائٹی) کے قیام کے لئے خود قاعدے مقرر کر لیتے ہیں۔ اسی کو ضابطہ اخلاق کہا جاتا ہے۔ جس کی حیثیت فقط اتنی ہوتی ہے۔ کہ انسانوں نے متفقہ طور پر اس ضابطہ کو اختیار کر لیا ہوتا ہے۔ جیسے یورپ میں سڑک کے بائیں طرف چلنا قانون راہروی ہے اور امریکہ میں دائیں طرف چلنا۔
IV۔ اور ان ضوابط پر پابندی کا محرک جذبہ، خوف انتقام یا مواخذہ قانون ہوتا ہے۔ اگر کوئی اس خوف سے بچنے کا انتظام کر لے تو پھر اسے پابندی کی ضرورت نہیں رہتی۔
V۔ اس نظام کی پابندی سے جماعتی قوت حاصل ہوتی ہے۔ جو تسخیر قوائے فطرت کے ساتھ مل کر، اس قوم میں طبیعی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔
VI۔ اور چونکہ زندگی ان کے نزدیک صرف یہی طبیعی زندگی ہے۔ اس لئے جس طریق سے یہ صلاحیت حاصل ہو جائے۔ وہی طریقہ مستحسن قرار پاتا ہے۔
اس کے برعکس دوسری تہذیب کی رو سے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔
(ا) نظام طبیعی کے علاوہ ایک اور نظام بھی ہے۔ جسے نظام مکافات عمل کہتے ہیں۔ اس نظام میں ہر عمل کا ایک نتیجہ معین ہوتا ہے۔ اور کوئی عمل بلا نتیجہ نہیں رہ سکتا۔ اعمال کے نتائج دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جس سے شرف انسانیت کی نشوونما و بالیدگی و برومندی ہوتی ہے۔ اور دوسرا وہ جس سے اس میں ضعف و انحطاط پیدا ہو جاتا ہے۔
(ب) نظام طبیعی کی پابندیوں سے طبیعی زندگی کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور نظام مکافات عمل کے اتباع سے انسانی زندگی میں صالحیت پیدا ہوتی ہے۔
(ج) صالحیت میں "صلاحیت" خود بخود آجاتی ہے۔ لیکن صرف "صلاحیت" میں صالحیت نہیں آسکتی۔
اس مفصل بحث سے ہر شخص اس نتیجہ پر آسانی سے پہنچ سکتا ہے۔ کہ:۔
(۱) مغرب کے میکانکی نظام میں طبیعی زندگی کی صلاحیت مقصود ہے۔
(۲) قرآن کے نظام ایمان و عمل میں طبیعی زندگی کی صلاحیت کے ساتھ ماورائے حیات طبیعی کی صالحیت بھی آجاتی ہے۔
(۳) عجمی اسلام کے نظام تنویم میں نہ صلاحیت ہوتی ہے نہ صالحیت۔
(اس بحث پر مزید مطالعہ کے لئے علامہ سید علی نقی صاحب قبلہ مجتہد کی مشہور تصانیف جو

کتابچوں کی صورت میں ہیں کافی مفید ہوسکتی ہیں۔ آپ کی قلمی کاوشوں پر ملت کو بجا طور پر ناز ہے۔ اس بحث کے لئے "خدا کا ثبوت" "آثار قدرت" "شیعیت کا تعارف" "نظام زندگی حصہ اول" اور "اسلام وانسانیت" کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ؎

(قسط دوم) شیعہ کلچر جو دنیاوی تہذیب سے بالکل الگ تھلگ اور مختلف النوع عقائد پر استوار ہے۔ دنیا میں بے مثل اور انسانیت کے تخلیقی مقاصد سے ہم آہنگ ہے۔ حقیقی آزادی کا گل سر سبد اور تعلیمات الٰہیہ کا لاثانی شاہکار اپنی تعلیمات کو صرف ایک ہی نقطہ میں سمو کر رکھ دیتا ہے۔ اس کی تعلیمات کا نچوڑ صرف وحدت خالق اور وحدت خلق ہے اور دراصل سارے کلچر کی عمارت ان ہی دونوں موضوعات پر استوار ہوتی ہے۔ اب چند جملے عاریتاً دیجئے تاکہ اس سلسلہ میں بےلاگ گفتگو کی جاسکے۔

خدا کے تصور کے ساتھ ہی ذہن انسانی کو مختلف ذہنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے ذہن انسانی میں خدا کا تصور مختلف ہوتا ہے۔ اور حقیقی تصور کا فقدان اس صورت میں حاکم کا خدا الگ ہوتا ہے۔ اور محکوم کا خدا۔ ظالم کا علیحدہ، مظلوم کا الگ، شاہ کا الگ، فقیر کا جدا۔ یعنی خدا کے متعلق جو تصور اس طرح قائم ہوتا ہے، وہ نہ صرف مضحکہ خیز بلکہ غیر مضر بھی نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں یہ طرز عمل عام مشاہدہ میں آیا ہے۔ کہ جب دو مختلف اشخاص کسی مقدمہ میں مبتلا ہوں تو فریقین میں سے ہر ایک اپنی جیت کے لئے دعا مانگتا ہے۔ یہ طرز عمل کس چیز کی غمازی کرتا ہے۔ یہی ناکہ خدا کا تصور ان کے ذہنوں میں معدوم اور عقل محدود و کنہ حقیقت سے معذور۔

دنیا جب بھی خدا کے تصور کے متعلق بات کرتی ہے۔ تو وہ بات حقیقت خدا کے متعلق نہیں ہوتی بلکہ خدا کے متعلق انسانی تعبیرات (Our ideas about God) سے متعلق ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ذہن انسانی میں خدا کا انفرادی تصور نے جگہ پالی ہوتی ہے۔ ہر فرد کے ذہن میں خدا کا الگ الگ اور انفرادی تصور ہمیشہ داخلی ہوتا ہے۔ اس لئے ہر فرد کا خدا الگ الگ ہوتا ہے۔ حتی کہ ایک ہی فرد کی مختلف حالتوں میں مختلف خداؤں کا پایا جانا بھی ناگزیر ہے۔ بیماری کی حالت کا خدا اور تندرستی کی حالت کا اور، صفراوی غلبہ کی صورت میں خدا اور، بلغمی مزاج کا خدا اور بیماری اور صحت کے دیوتا الگ — افراد سے آگے بڑھا جائے تو قبائلی خدا کی باری آتا ہے ایک جابر و سرکش قوم کا خدا اور قسم کا ہوگا۔ اور مظلوم و مقہور قوم کا خدا اور قسم کا۔ نقلوں کا

؎ یہ کتابیں آپ دفتر ادارۂ معارف اسلام سے حاصل کر سکتے ہیں۔

نقد و نظر

(۱) اظہارِ حق

یعنی خطبہ حضرت مخدومۂ کونین صدیقہ کبریٰ فاطمۃ الزہرا صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہا۔ کل صفحات ۵۲ تا ٹائیٹل علیحدہ۔ ناشر مرکزی سیرۃ الزہرا کمیٹی حیدرآباد دکن۔ (آندھرا پردیش) قیمت کتاب پر درج نہیں۔

سیرۃ الزہرا کمیٹی کی خدمات لائقِ صد تحسین و آفرین ہیں۔ ابتدا کتاب میں کمیٹی کے اغراض و مقاصد درج ہیں جو کہ کمیٹی کے نام ہی سے ظاہر ہیں۔ یعنی صرف جنابِ صدیقہ طاہرہ کی مقدس سیرۃ اور جملہ واقعات زندگی اور حضرت کے علوم و معارف کی نشر و اشاعت اور آپ کے فضائل و مناقب و مصائب و شہادت کو بار بار دہرانا۔ بعد ازاں جناب سیدہ کا وہ مشہور و معروف خطبہ (عربی متن اردو ترجمہ) درج ہے۔ جو تاریخ میں "خطبۂ فدک" کے نام سے مذکور ہے جو جناب سیدہ سلام اللہ علیہا نے حضرت ابوبکر کی کچہری میں ارشاد فرمایا۔ حضرت ابوبکر کا جواب اور جناب سیدہ کا جواب الجواب بھی درج ہے۔ آغاز میں آرٹ پیپر پر جنابِ طاہرہ کے روضۂ مبارک کی دو تصویریں چھپی ہیں جو جنت البقیع میں مزار اقدس کی قبل انہدام اور بعد انہدام ہر دو صورتیں پیش کرتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ سیرۃ الزہرا کمیٹی نے یہ کتاب چھپوا کر ایک اہم کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

(۲) کتاب مستطاب البلاغ المبین

(در بحث خلافت اسلامیہ) جلد اول حصہ سوم (کتاب الاسناد والتراجم) علاوہ ٹائیٹل ۱۰۱۶ بڑے صفحات پر مشتمل ہے۔ تالیف سلطان القلم آغا محمد سلطان مرزا۔ ڈسٹرکٹ و سیشن جج ریٹائرڈ۔ قیمت فی جلد غیر مجلد ۱۲ روپے مجلد ولایتی ۱۳ روپے خرچہ ڈاک علیحدہ۔ ناشر کتب خانہ حسینیہ۔ محلہ شیعاں موچی گیٹ لاہور۔

کتاب اتنی خوبیوں کی مالک ہے کہ تین مرتبہ چھپ چکی ہے۔ یہ تیسرا ایڈیشن جو زیر نظر ہے۔ گذشتہ ایڈیشن سے ۴۰ صفحات کا مضمون اس میں قبلہ آغا صاحب نے زائد درج کیا ہے۔ یہ کوئی نئی کتاب نہیں۔ مشہور و معروف کتاب ہے۔ جو اسلامی دنیا سے داد

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

تحسین لے چکی ہے۔ بحثِ خلافت میں مجوزہ مضامین تحقیقات اور استدلال اس قدر وزنی اور پختہ کہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔

ہمارا دعویٰ ہے۔ کہ اس کا حرف دیباچہ (جو علوم و معارف سے بھرپور ہے) پڑھنے سے ہی دل روشن ہو جاتا ہے۔ اور تاریخِ اسلام کے صحیح واقعات کا نقشہ آنکھوں کے آگے پھر جاتا ہے۔ ہر ذی علم مسلم کے پاس اس کتاب کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

ادارۂ معارفِ اسلام خریداری کے لئے اپیل کرتا ہے۔

(۳) حسینؑ دی بھین یعنی صدقہ صغریٰ

:- یہ کتاب $\frac{20 \times 30}{16}$ کے ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ سرورق رنگین طباعت موزوں و پسندیدہ ہے۔ قیمت ۱۲/- مؤلف و ناشر :- صوبیدار پنشنر چوہدری اللہ دتا صاحب بھٹی۔ کاظمینی اسٹور کیمپ (ایم۔ ٹی) محلہ جگ۔ موضع اوگنڈ۔ ڈاکخانہ اجنیانوالہ (ضلع شیخوپورہ)

واقعاتِ کربلا پر یہ دلنشیں پنجابی نظموں کا ایک مجموعہ ہے۔ جس میں آغازِ اسلام سے لیکر امیر مختار بن ابو عبیدہ ثقفی تک کے حالات درج ہیں۔ اور بالخصوص شریکۃ الحسینؑ بنت فاطمۃ الزہرا اور شاہِ لافتی مولائے کائنات امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی دختر نیک اختر حضرت زینب سلام اللہ علیہا کی ان قربانیوں کے ولولہ انگیز حالات بیان کئے گئے ہیں جو آپ نے حفاظتِ بیضۂ اسلام کے لئے میدانِ کربلا اور کوفہ و شام میں رہی۔ پنجابی اور بالخصوص دیہاتی حضرات کے لئے نہایت کارآمد کتاب ہے۔ پتہ مذکورہ پر مؤلف سے خرید فرماویں۔

(۴) دیہاتی زندگی اور قرآن

۳۲ صفحات $\frac{20 \times 30}{16}$ کا یہ اہم رسالہ (جس کی قیمت صرف ۲ روپے) بھی پنشنر صوبیدار اللہ دتا صاحب بھٹی پتہ موضع اوگنڈ ضلع شیخوپورہ ہی نے شائع کیا ہے۔ اس میں نائب صدر ادارۂ معارفِ اسلام جناب پروفیسر سید فقیر حسینؑ صاحب بخاری ایم اے کا "اصولِ قرآن فہمی" کے متعلق معرکۃ الآرا مضمون درج ہے۔ قرآن فہمی کے لئے اس مضمون کا پڑھنا نہایت ہی مفید اور معلومات افزا ہے۔

(ادارہ)

ضروری گذارشات :- (۱) جواب طلب امور کیلئے جوابی کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے۔

(۲) خط لکھتے وقت خریداران ماہنامہ اپنا خریداری نمبر اور ممبران ادارہ اپنا رکنیت نمبر کاچٹ سے دیکھ کر حوالہ ضرور دیا کریں۔

(۳) اپنے اپنے ذمہ بدل اشتراک یا زرِ رکنیت اپنی پہلی فرصت میں ارسال فرمائیں۔

(ادارہ)

اطلاعات و اعلانات

(۱) ادارۂ معارف اسلام کے علمی بورڈ کی ایک اہم نشست مورخہ ۹ نومبر ۱۹۵۵ء بروز اتوار دفتر ادارہ میں منعقد ہوئی بورڈ نے اپنا طریق کار مقرر کیا۔ مسودات موصول شدہ کو ممبران بورڈ میں برائے گردش مطالعہ پیش کیا گیا۔ بالاتفاق رائے طے پایا کہ ماہنامہ معارف اسلام کیلئے ہر ماہ بورڈ کا ایک رکن اپنا مضمون برائے اشاعت دیوے۔ اسلامک انسائیکلوپیڈیا جو پنجاب یونیورسٹی چھاپ رہی ہے۔ اس کے متعلق بھی مفید تجاویز منظور کی گئیں۔

(۲) ادارہ کی مجلس نظامت کی سال رواں کی پہلی میٹنگ ۹ نومبر ۱۹۵۵ء بروز اتوار دفتر ادارہ میں منعقد ہوئی۔ جس میں ادارہ کے مالیات کے متعلق نہایت ضروری تجاویز طے پائیں۔ اور کئی مفید منصوبے آئندہ سال کے لئے منظور کئے گئے۔

(۳) درس قرآن:- ادارہ کی مجلس نظامت کی حالیہ میٹنگ میں بحث تمحیص کے بعد بالاتفاق رائے فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ ماہ رمضان المبارک میں کسی مناسب مقام پر درس قرآن کا سلسلہ جاری کیا جائے۔ جس میں درس قرآن کے تحت عوام الناس کے مفاد کے پیش نظر درس حدیث و درس اخلاق پر زور دیا جائے۔ لہٰذا عہدیداران ادارہ اس اہم منصوبہ کو جامۂ عمل پہنانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

(۴) کتب زیر طبع:- آئندہ سال کے لئے مندرجہ ذیل کتب کی طباعت کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ جن کے لئے انتظامات شروع ہو گئے ہیں۔ شائع ہونے کے فوراً بعد ممبران ادارہ کی خدمت میں حسب معمول ارسال ہوں گی۔

(۱) توحید امام جعفر صادق علیہ السلام کا

(باقی صفحہ ۵۲ پر)

ترجمہ فی حدیث مفضل بن عمر کی تلخیص جو محترم سید ظفر حسین صاحب نقوی (اسلامک ریسرچ سنٹر بھکر) کر چکے ہیں۔ مسودہ تیار ہے۔ اور کتابت شروع ہوا ہی چاہتی ہے۔

(۲) **تحفۂ زوجین** :- حضرت علامہ مرزا احمد علی صاحب قبلہ کی تالیف ہے۔ دوسرا ایڈیشن مع ضروری اور مفید اضافوں کے شائع ہو گا۔ تعلقات زن و شوہر کے متعلق نہایت ہی پاکیزہ کتاب ہے۔ اور تمام استدلال قرآن حدیث اور اقوال معصومین سے کیا گیا ہے۔

(۳) **نفس رسولؐ** :- حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی مختصر تالیف مع اسناد کے محترمہ بیگم شیخ فیروز الدین کی تالیف ہے۔ اور اس کا بھی مناسب اور مفید اضافوں کیساتھ دوسرا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے۔

(۴) **افادیت نماز و روزہ** :- یہ کتاب آقائے حشمت السلطان دولت شاہی بانیٔ انجمن تبلیغات اسلامیہ (طہران) کی تصنیفات میں سے ہے۔ جس میں فروع دین اسلام میں سے پہلے دو یعنی صلوٰۃ اور صوم کے متعلق زندگی کے پانچ زاویوں یعنی دینی۔ روحانی۔ جسمانی۔ اخلاقی و اجتماعی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ طب و سائنس امروزہ سے استدلال کیا گیا ہے

فارسی سے اردو میں حضرت آقائے الحاج سید الف شاہ صاحب پاکنہاد ترجمہ فرما رہے ہیں۔ قارئین دعا فرماویں کہ ادارہ جلد از جلد ہر چہار کتب کی طباعت سے فارغ ہو سکے۔

(ادارہ)

قصہ تفسیر بالرائے مع ضمیمہ معارف الفرقان (از علامہ سید امداد حسین کاظمی و علامہ الحاج مرزا احمد علی) اس کتاب میں تمام مسائل پر قرآن اور سائنس سے مکمل روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ثابت کیا گیا ہے کہ بغیر اہلبیتؑ کے تفسیر قرآن کا سمجھنا محال ہے۔ کل صفحات ۷۰۴ قیمت مجلد ۱۴ غیر مجلد ۱۲

مواعظ حسنہ (از سرکار شیخ عبد العلی الہروی الطہرانی) یہ ان معرکۃ الآرا مواعظ فصیحہ و بلیغہ کا مجموعہ ہے جس سے لاکھوں انسانوں نے فائدہ اٹھایا۔ جو علوم دین و دنیا اور قرآن و سائنس سے لبریز ہے۔ مرتبہ و مؤلفہ علامہ سید محمد سبطین صاحب سرسوی۔ ہر چہار حصص۔ ۸۰ مواعظ صفحات ۳۵۰ بڑا سائز قیمت :- پانچ روپے۔ بغیر خرچہ ڈاک

کتاب مستطاب تحقیق حدیث انا مدینۃ العلم ... الخ کتاب کا موضوع عنوان سے ظاہر ہے۔ سلسلہ معارف اسلام کا یہ پینتیسواں ۳۵ نمبر چھپ کر تیار ہو گیا ہے جو کہ سید الحکماء آقائے سید الف شاہ صاحب پاکنہاد اور مدیر ادارہ معارف اسلام کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ صفحات ۹۰ صفحے قیمت ۱ روپیہ علاوہ محصول ڈاک اسلامی معاشرہ ۔ علم عقائد اسلام فی تعلیمات اہلبیت علیہم السلام

قوم جفاکار سے اینٹیں کھاتے رہے۔ سینکڑوں سال تبلیغ کے باوجود قوم عیش وعشرت میں مبتلا رہی۔ ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکا گیا۔ درآنحالیکہ نمرود کرسی حکومت پر متمکن تھا۔ موسیٰ ع نبی اور اپنی قوم کی جان بچانے کے لئے ہجرت پر مجبور ہوئے۔ اور فرعون دعویٰ خدائی کر کے لوگوں سے سجدے کروا رہا تھا۔ عیسیٰ کو ذلیل کیا گیا۔ اور قید خانے میں ڈالا گیا۔ اور ہیرودیس داد عیش دے رہا تھا۔ محمد مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جس قدر جسمانی و روحانی اذیتیں برداشت کیں۔ ان کا احاطہ محال ہے۔ حد یہ کہ شعب ابوطالب علیہ السلام میں جا کر محصور ہوئے۔ جناب خدیجۃ الکبریٰ (علیہا السلام) کی بے پایاں دولت اور حضرت ابوطالب (علیہ السلام) کی ثروت ختم ہو گئی۔ بلاذاں پتے کھانے پر مجبور ہوئے۔ بالآخر ہجرت تک نوبت پہنچی اسی سے اس وقت کفار کی طاقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح حسینؑ علیہ السلام کربلا میں اپنے خاندان اور اعزہ و انصار سمیت لاانتہا مصیبتیں جھیل کر شہید ہو گئے۔ اقتدار حکومت ان کے ہاتھوں میں نہ تھا۔ سلطنت یزید اُس وقت تمام دنیا کی سلطنتوں سے بڑی تھی۔ بقایا آئمہ طاہرین کی زندگیاں بھی اسیطرح بسر ہوئیں۔ یہ تمام بزرگان دین اقتدار حکومت جن کے سپرد کیا گیا۔ یا بعدازاں جن کے ہاتھوں میں آیا مگر اس وقت کہ ابھی اقتدار ان کے ہاتھوں میں نہ آیا تھا۔ کیا یہ مقدسین دنیا میں حکومت کے سب سے زیادہ اہل نہ تھے۔ درآنحالیکہ یہ ہر صفت میں اپنے اپنے وقت میں سب سے بلند تھے۔ پھر کیا ان میں سے ہر ایک کے مد مقابل گروہ کو غاصب نہ سمجھا جائے۔ ظاہر ہے۔ کہ باوجود اس کے کہ یہ استحقاق واہلیت حکومت رکھتے تھے۔ مگر مخالفین دین اللہ کے اعمال کی وجہ سے یہ حق ان کو نہ پہنچ سکا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ عہدۂ نبوت یا امامت ان سے چھن گیا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ حکومت اس عہدہ الہٰی کا لازمہ نہ تھا۔ عہدۂ الہٰی کا حامل اپنی جگہ پر قائم تھا۔ اگرچہ حاکم اُسے ہی ہونا چاہیئے تھا۔ مقصد بیان یہ ہے۔ کہ شہید اعظم للناس یا شاہد رسالت محمدیہ کا مقام اقتدار حکومت سنبھال لینے سے حاصل نہیں ہو جاتا۔ اور جن حضرات کا منتہٰی نظر اس دور سیاست میں محض کرسی حکومت ہو۔ ان کا اپنے خیال ناقص وزبان باطل میں امیر جمیع المسلمین بن جانے کا خواب دیکھنا سراسر خلاف اسلام ومخالفت دین اللہ ہے۔

امام تمام امت کے اعمال کا گواہ

باب گذشتہ کی ابتدا میں اسلام میں گواہی کی اہمیت کو مختصراً واضح کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ گواہی اتمام حجت کیلئے ضروری ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ خود احکم الحاکمین اور عالم الغیب والشہادہ ہونے کے باوجود بغیر گواہی کے کسی کو اس کے عمل کی سزا و جزا نہ

دے گا۔ بعض اعمال ایسے ہیں۔ جو صرف انسان کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً عبادات و نیت سو نیک و بد وغیرہ ان کے لئے بھی کراماً کاتبین اور خود اعضائے انسانی کی گواہی کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ چہ جائیکہ ایسے اعمال جن کا انسان کی اپنی ذات سے علاوہ دوسروں سے تعلق ہو۔ خود اہل اسلام (جن کا خدا کے دین کامل پر عمل کرنا ضروری ہے) کی شہادت انکے اپنے معاملات میں قبول نہیں۔ دعوے کے ثبوت میں دو شاہدان عادل کو پیش کرنا ضروری ہے۔ اور بعض معاملات میں چار گواہوں کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ لہٰذا اعمال کی گواہی عدل کے عین مطابق ہے۔ خداوند تعالےٰ نے عدل کو معمولی سے معمولی جگہ پر بھی نظر انداز نہیں فرمایا۔ چونکہ ہر زمانہ میں نائب خدا یعنی امام وقت کا وجود حجت لازمی ہے۔ اور یوم ندعوا کل اناس بامامھم (قرآن) اس پر شاہد ہے۔ لہٰذا گواہ کا وجود اس لئے ضروری ہے۔ کہ یوم جزا کو فیصلے کے وقت خدا کی طرف سے اتمام حجت ہو جائے۔ گواہ عمل نیک و بد کیلئے ایک دلیل ہے۔ جو راہ خدا میں مارا جائے اسے شہید محض اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وجود باری تعالیٰ کیلئے ایک دلیل بن جاتا ہے۔ جو ایک بڑا رتبہ ہے۔ مگر امام جو کہ وجود باری تعالیٰ و رسالت محمدیہ کی دلیل ہوتا ہے (جیسا کہ باب گذشتہ میں وضاحت کی گئی ہے) کا بحیثیت امام وقت تمام امت کے اعمال کا گواہ ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ حجت اللہ نہیں کہلا سکتا یعنی اگر امام کو تمام امت کے اعمال کا گواہ نہ سمجھا جائے تو عقلاً حجت تمام نہیں ہوتی۔ اس لئے قرآن حکیم میں واضح طور پر ارشاد رب موجود ہے۔ کہ

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا	اور اسی طرح ہم نے تمکو مرکزی (درمیانی) امت مقرر کیا۔ تاکہ تم انسانوں پر گواہ رہو۔ اور رسولؐ تم پر گواہ رہیں۔

(پ۲ ع ۱ البقرۃ)

خالق مطلق خود عالم الغیب والشہادہ ہے۔ وہ ہر شے کے ذرہ ذرہ سے واقف ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں۔ لہٰذا ہمارے تمام اعمال نیک و بد کے متعلق جو کچھ بھی وہ فیصلہ فرمائے وہ عدل ہے۔ مگر اسلام چونکہ ایک دین ہے۔ ایک دستور ہے۔ اس کا کوئی بھی کام بے ضابطہ نہیں۔ ہمارے اعمال خیر و شر کے فیصلہ کے وقت اتمام حجت ضروری ہے۔ تاکہ کسی کے لئے یہ کہنے کی گنجائش باقی نہ رہے۔ کہ یہ فیصلہ جزا و سزا غلط ہوا ہے۔ لہٰذا شہید علی الناس کا وجود لازمی ہے۔ آیت منقولہ بالا میں یہی بیان کیا گیا ہے۔ اس میں قابل تدبر یہ امر ہے۔ کہ تمام انسانوں کے اعمال کا گواہ کون ہو سکتا ہے۔ عمل نیک بھی ہوتا ہے اور بد بھی اور ان اعمال کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز نیت ہے۔ اگر کوئی نیک عمل

بدنیتی سے کیا گیا۔ تو آدمی دوہرے جرم کا مرتکب ہو گا۔ مثلاً کسی کو نقصان پہنچانے کیلئے پہلے اس کا اعتبار اپنے اوپر جمانا یعنی دکھاوے کا کارِ خیر سرانجام دینا مثلاً نماز پڑھنا۔ اس فعل میں خالق و مخلوق دونوں کو دھوکا دیا گیا۔ بدنیتی کی وجہ سے کارِ خیر کی جزا کی بجائے سزا ملی۔

وَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ○ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ○ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ○ (پس ویل ہے اُن نماز پڑھنے والوں کے واسطے جو اپنی نماز سے غفلت کرتے ہیں۔ اور جو دکھاوے کی نماز پڑھتے ہیں)

قرآن پ ۳۰ الماعون

اسی طرح کسی مظلوم کو بچانے یا فتنہ و فساد کو رفع کرنے کے لئے غلط الفاظ استعمال کرنا۔ حالانکہ ایک لحاظ سے اس نے غلط بیانی کی مگر اس سے کسی کو گناہ کرنے سے بچا لیا گیا یا فتنہ و فساد رفع ہو گیا۔ اس غلط بیانی کا اُسے ثواب ملے گا۔ لہٰذا نیّت اعمال کے سلسلہ میں مقدم ہے۔ اس مقام پر آ کر ہر اس فرد کی گواہی بیکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ جو فاعل کی نیّت سے واقف نہ ہو۔ لہٰذا صحیح معنوں میں اور فی الحقیقت گواہ وہی ہو سکتا ہے۔ جو فاعل کی نیّت تک سے آگاہ ہو۔ امام چونکہ اپنے وقت میں خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ ہوتا ہے۔ اس لئے اسے اس آیت میں "امتِ وسط" کے نام سے پکارا گیا ہے ۱؎ تاوقتیکہ وہ مخلوق کے احوال سے کما حقہ واقف نہ ہو۔ وہ واسطہ نہیں بن سکتا۔ لہٰذا امامِ وقت محض وہی ہو سکتا ہے جو اپنی ولائیت کے امورِ جزو و کل سے مکمل طور سے آگاہ ہو۔ قولِ حکیم مشرق و نباضِ ملت اقبالؒ اس کی وضاحت کرتا ہے ۔

نائب حق ہمچو جانِ عالم است ہستی او ظلِ اسم اعظم است

از رموزِ جزو و کل آگاہ بود در جہاں قائم بامر اللہ بود

پختہ سازد فطرتِ ہر خام را در حرم بیروں کند اصنام را ...... (اسرار خودی)

ان متقدمین کا "اُمتِ وسط" قرار دیا جانا ہی محض اس لئے ہے۔ کہ وہ شہداء علی الناس ہیں۔

۱؎ اعتراض ۔ "امت" گروہ کو کہتے ہیں مگر امام اپنے وقت کا ایک ہوتا ہے۔ لہٰذا فردِ واحد کیلئے "امت" کا لفظ کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

جواب:۔ آیت منقولہ میں "امت وسط" صرف ایک امام کو نہیں کہا گیا۔ بلکہ اپنے اپنے وقت کے امام آئمہ طاہرین کے گروہ کو خطاب ہے۔ خود جس دور میں آیت نازل ہوئی یعنی عہد رسولؐ میں تین امام جناب امیر المومنینؑ و حسنینؑ علیہم السلام موجود تھے۔ مؤلف

جہاں تک اعمالِ بد کا تعلق ہے۔ وہ بالعموم چھپ کر کیے جاتے ہیں۔ جرم پوشیدگی میں کیا جاتا ہے تاکہ دوسروں کو علم نہ ہو سکے۔ نیک آدمی عملِ نیک بھی چھپ کر ہی کرنے کی کوشش کرتا ہے ورنہ وہ کی نیکی "نیکی" نہیں کہلاتی۔ لہٰذا تمام انسانوں کی گواہی وہی دے سکتا ہے۔ جو تمام انسانوں کے ظاہر و پوشیدہ اعمالِ نیک و بد سے نہ صرف واقف ہو۔ بلکہ چشم دید گواہ ہو۔ ورنہ سنی سنائی پر تو کوئی عام عقل کا آدمی بھی اعتبار نہیں کرتا۔ چونکہ عمل ہر انسان کا جدا جدا ہوتا ہے۔ کوئی کسی دوسرے کے عمل کا ذمہ دار نہیں۔ بلکہ ہر ایک اپنے اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے۔ لہٰذا امامِ وقت کا فرداً فرداً ہر انسان کے عمل سے واقف ہونا ضروری ہے۔ تاکہ وہ حقیقی معنوں میں "شہید علی الناس" ثابت ہو سکے ورنہ آیتِ قرآن غلط ہو جائے گی۔ (نعوذ باللہ) اس کی **مثال** روحِ انسانی کی سی ہے جو کہ نہ صرف عمل بلکہ نیت تک سے واقف ہوتی ہے۔ اسی لئے امام کو "روحِ عالم" یا بقول اقبالؒ "جانِ عالم" کہا گیا ہے۔ قرآن میں اسی مضمون کو "وکل شیء احصینٰہ فی امام مبین ۝" سے بھی ظاہر کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین کا یہ قول بالکل غلط اور خلافِ عقل ہے۔ کہ "امتِ وسطاً" سے مراد تمام "**امتِ** محمدیہ" ہے۔ حالانکہ یہ بالکل واضح ہے۔ کہ نبوتِ محمدیہ صرف مسلمانوں کیلئے ہی مخصوص نہیں بلکہ جمیع موجوداتِ انسان و حیوان۔ چرند و پرند شجر و حجر جنات و ملائکہ یا انبیاء و مرسلین اس عالم اور دیگر عالمین پر حاوی ہے۔ حضرت پیغمبرِ اسلام کسی مخصوص گروہ پر ہی مبعوث نہیں ہوئے۔ بلکہ جمیع طبقاتِ موجودات۔ مخلوقات پر مبعوث برسالت ہوئے۔ (اسکی مفصل قرآنی و عقلی بحث صـ۵ تا صـ۱۶ ملاحظہ ہو) جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام مخلوقات امتِ محمدیہ میں شامل ہے۔ اگر تمام امتِ محمدیہ ہی کو "امتِ وسط" سمجھ لیا جائے تو وہ گواہی کس کی دے۔ چہ جائیکہ قرآن شاہد ہے۔ کہ خود اہلِ دین اسلام کی اپنے معاملات میں بھی شہادت قبول نہیں۔ بلکہ ثبوتِ دعوے میں کم از کم دو شاہدان عادل کو بطور گواہ پیش کرنا ضروری ہے۔ اور جو فاسق ہے۔ شرعی طور پر اس کی گواہی قبول ہی نہیں۔ اس کے بیان کے لئے مزید دو گواہوں کی ضرورت ہے۔ جب یہ اس قابل نہیں کہ اپنے ہی حق میں درست بیان دے سکیں۔ تو دوسروں کے حق میں ان کی گواہی کیونکر قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔ اگر امت سے "حقیقی تابعین رسولؐ" مراد لیا جائے۔ تو بھی اہلبیت الطاہرین سب سے زیادہ تابعین رسولؐ ثابت ہوتے ہیں۔ اتنے تابع کہ "جزوِ نبوت" کہا گیا۔ اس کے متعلق چند اقوالِ رسولؐ صـ۱۴۱ و صـ۱۴۹ کے حواشی پر ملاحظہ فرماویں۔ اور جب تک ان پر درود نہ

بعد محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر درود تصور نہیں ہوتا۔ ہر مسلم کی نماز اس پر شاہد ہے۔ ہر زمانے کے امام کے اپنے عہد کے انسانوں پر شہید ہونے کے متعلق دو آیات قرآن یعنی يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ۔ (پ ۱۵ ع ۸ بنی اسرائیل) یعنی جس دن ہم ہر گروہ کو اس کے امام کے ساتھ بلائیں گے اور وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِن كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا (پ ۱۴ ع ۱۸ النحل) یعنی اور جس دن ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کو بلائیں گے۔ بالکل واضح کر دیتی ہیں۔ ہر زمانے کا ایک امام ہوتا ہے۔ اور وہی اُن کا گواہ بھی ہوتا ہے۔

اس باب اور اس سے پہلے باب کے بیانات سے یہ امر بالکل واضح ہو گیا۔ کہ امام جس طرح شاہد رسالت ہوتا ہے۔ اسی طرح شہید علی الناس بھی ہوتا ہے۔ اور یہ وصف شہیدیت "ناظر علی الشیء" کے معنوں میں ہے۔ جس کی مزید توضیح مندرجہ ذیل آیت قرآن سے ہوتی ہے۔

وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ ط وَسَتُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ○ (پ ۱۱ ع ۲ التوبہ)

اور (ان سے یہ) کہہ دو (اے پیغمبر) کہ عمل کرو۔ پس دیکھے گا اللہ عمل تمہارے اور اُسکا رسول اور المومنون اور لوٹائے جاؤ گے تم غائب و حاضر کے جاننے والے کی طرف اور جو کچھ تم کیا کرتے تھے۔ وہ تم کو اُس سے آگاہ کرے گا۔

"مومنون" پر "ال" لگا کر ان کی تخصیص کر دی گئی ہے۔ جس سے معلوم ہوا۔ کہ یہ مومنون کا مخصوص طبقہ ہے۔ جس میں سوائے آئمہ یا انبیاء کے اور کوئی شریک نہیں۔ آیت مذکورہ میں لفظ "فسیری" (پس دیکھے گا) نے ہمارے بیان کی وضاحت کرنے میں کافی مدد دی ہے۔ ایک تو "سیری" پر حرف عطف یعنی "ف" لگا کر یہ واضح کیا کہ انسانوں کا عمل فوراً اُسی وقت دیکھیں گے۔ بعد میں نہیں اور دوسرے "دیکھ کر" گواہی دینا ثابت ہوا۔ نہ کہ شنید پر۔ شنید کے بود مانند دیدہ۔ مگر دیکھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ شہید بوجود شخصی ہر جگہ موجود بھی ہو۔ بلکہ وہ اپنے مقام پر ہی سب کچھ دیکھ سکتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کی تشریح میں جناب علامہ شیخ محمد علی الہروی اعلی اللہ مقامہ[۱] کے اُس بیان کا ایک حصہ پیش کر دیا جائے۔ جو کہ اُن کے مشہور مواعظ (مندرجہ کتاب مواعظ حسنہ) میں اسی آیہ مجیدہ کی تشریح کے طور پر درج ہے:-

---

۱ مندرجہ حصہ دوم مواعظ ہفتم۔ یہ کتاب ادارہ معارف اسلام کے دفتر سے مل سکتی ہے۔

"**شہید و رویت اعمال**:۔ اس آیت میں رویتِ خدا و رسولؐ اور مومنوں کو سلسلہ وار ایک جگہ ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن رویت تینوں درجات میں یکساں نہیں۔ نحوین کہتے ہیں۔ یہاں "س" استقبال کے واسطے ہے اور مراد یہ ہے۔ کہ قیامت میں خدا تعالیٰ اور رسولؐ اور مومنوں اعمال کو دیکھیں گے۔ لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ اگر "س" استقبال کے معنوں میں لیا جائے تو کفر محض ہے۔ کیونکہ نفی رویتِ باری تعالےٰ لازم آتی ہے۔ کہ اس وقت خدا تعالیٰ ہمارے اعمال کو نہیں دیکھتا اور ان سے بے خبر ہے۔ اور یہ مطلقاً محال ہے اور کفر۔ حق یہ ہے۔ کہ یہ الفاظ ہر ایک مقام پر یہی معنی نہیں دیتے۔ بلکہ کلام خدا میں اکثر اسی قسم کے الفاظ ترجی و تمنی وغیرہ تاکید کے واسطے استعمال ہوتے ہیں۔ یا بمعنی دوام و استمرار اور یہ بات قرآن سے معلوم ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ سین و سوف استقبال کیلئے بھی آتے ہیں۔ جیسا کہ اس آیت کے دوسرے جزو یعنی سَتُرَدُّونَ اِلٰی عَالِمِ الْغَیْبِ وَالشَّہَادَۃِ میں ہے جس سے مراد قیامت ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آیت کے جزوِ اوّل "فَسَیَرَی اللّٰہُ" میں سین استقبال کیلئے نہیں ہے۔ اور یہ غلط ہے کہ اس رویت سے مراد رویتِ قیامت ہے۔ کیونکہ رویتِ قیامت کا ذکر آیت کے دوسرے جزو "وَسَتُرَدُّونَ" میں موجود ہے پس ضرور اس رویت سے مراد رویت دنیا ہی ہے۔ کہ یہاں ہمارے اعمال کو خدا تعالیٰ اور رسولِ خدا اور مومنون دیکھتے ہیں۔ اور مومنون سے مراد وہی شہید یعنی امام ہیں۔

شبہ۔ کلام حمید میں لفظ شہید جہاں خدا کے واسطے استعمال ہوتا ہے۔ تنہا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ بہ تحقیق اللہ ہر شے پر شہید ہے۔ رسولؐ کا ذکر نہیں۔ اور دوسری جگہ جہاں رسولؐ و ائمہؑ کے واسطے استعمال ہوا ہے۔ وہاں خدا کا ذکر نہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہادتِ خدا غیر شہادت رسولؐ و امام ہے اور اسی آیت میں رویت

خدا تعالیٰ اور رسولؐ و آئمہؑ کو ایک جگہ مساوی طور پر ذکر کیا گیا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تینوں رویت میں یکساں ہیں۔ اور یہ اطلاق کو رویت رسولؐ بعینہٖ رویت خدا ہے۔ یا خدا و رسولؐ و امام اس میں یکساں ہیں۔ شرک ہے۔ اور منافی آیاتِ دیگر؟

جواب شبہ یہ ہے کہ اگر آیت مذکورہ میں متعلق رویت یعنی عملکم تمام موضوعات کے آخر میں مذکور ہوتا تو بیشک سب کی رویت یکساں ہوتی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ عملکم بعد لفظ "اللّٰہ" مذکور ہوا ہے۔ جو متعلق ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ عمل سے بالذات صرف رویت خدا تعالیٰ کو متعلق ہے۔ اور اسی کی رویتِ حقیقی و اعلیٰ ہے۔ اور رسولؐ خدا و آئمہؑ ہدیٰ کی بالعرض و بالتبع من جانب اللّٰہ۔ لہٰذا رویت یکساں نہیں۔

(مواعظ حسنہ طبع سوم ص ۱۳۹)

"**حقیقت شہید**۔۔۔۔ اول شہید بالذات اللّٰہ ہے۔ اور بعد ازاں پیغمبرؐ شہید ہے ثانیاً و بالتبع اور پھر امام۔ اور شہیدیت بجسمیت نہیں ہے کیونکہ حضور الجسم عند کل شیٔ ممکن نہیں اور نہ حضور اشیاء عند الشہید ممکن ہے۔ بلکہ اس میں ایک قوت باطنیہ ہے۔ اس کے ذریعے سے وہ شہید ہے۔ اور وہ قوت مثلِ قوتِ باصرہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ قوت ہے کہ خود قوتِ باصرہ اس میں ہے۔ اور قوت باصرہ اس کی شعاعوں میں سے ایک شعاع ہے۔ اور اس کی تعریف ممکن نہیں مگر اوصاف سے اس کی معرفت ہو سکتی ہے۔

جس شے کے ادراک سے انسان عاجز ہو، اس کو چاہیئے کہ خود اپنے نفس میں نظر کرے اور اس کی مثال اس میں تلاش کرے۔ کیونکہ خدا نے ہر ایک شے کا نمونہ نفس انسانی میں پیدا کر دیا ہے۔ فقال عزّ و جلّ وفی الارض آیات للموقنین وفی انفسکم

اللہ تبصرون. غور کرنا چاہئے. کہ جب انسان سو جاتا ہے. اور خواب میں کہیں چلا جاتا ہے. اور سیر کرتا ہے. تو اس حالت میں بھی تمام چیزوں کو دیکھتا ہے.

پس کون قوت اور کونسی شے اس وقت دیکھتی ہے.؟ چشم ظاہری تو بستر خواب پر موجود ہے. اور بند ہے. کیونکہ اس کا تعلق جسم سے ہے. اور جسم کے ساتھ ہے. پس وہ دراصل حقیقت انسانیہ ہے. کہ اس میں قوت سماعت بھی ہے. بصارت بھی ہے حس بھی ہے. لمس بھی ہے. وغیرہ وغیرہ اور تمام اعضا اس کی وجہ سے کام کرتے ہیں. چنانچہ جب وہ قوت جاتی رہتی ہے. تو یہ تمام اعضاء و قوے بیکار ہو جاتے ہیں.

صفات خدائی دو قسم پر ہیں. ایک صفات ذاتیہ جن کے مقابل کوئی ضد نہیں ہے. دوم صفات افعالیہ جن کے مقابل ضد ہے. لیکن قسم اول صفات الٰہی عین ذات ہیں پس خدا بذات خود دیکھتا ہے. سنتا ہے. جانتا ہے. محتاج آلات نہیں ہے. اسی طرح انسان تمام افعال چلنے پھرنے. بولنے سننے اور دیکھنے کے حقیقت انسانیہ کرتا ہے. جب یہ قوت آنکھ سے ظاہر ہوتی ہے تو دیکھتا ہے جب کان سے ظاہر ہوتی ہے. تو سنتا ہے. پس حقیقت تمام قوے حقیقت انسانیہ ہے. اور سب اسی میں موجود ہیں. اور آلات اس کے محتاج ہیں. نہ کہ وہ آلات کا محتاج ہے. صرف عالم جسمانی میں ان آلات سے اس قوت کا ظہور ہوتا ہے.

پس جس طرح قوت انسانیہ جب جسم سے طالع ہوتی ہے. اشیاء کو دیکھنے لگتا ہے. اسی طرح جب قوت الٰہیہ چشم نبی اور امام سے ظاہر ہوتی ہے. تمام اشیاء کو دیکھتا ہے. یعنی تمام عالم امکانیہ کو. اور کان سے ظاہر ہوتی ہے. تو تمام آواز کو سنتا ہے. اسی طرح دوسری قوتیں. پس قوت قوت ذاتی بالذات پیغمبر نہیں بلکہ قوت الٰہی ہے. جو عطا ہوئی ہے. اور وہ قوت احاطی ہے. جو تمام اشیاء پر احاطہ رکھتی ہے."...... (مواعظ حسنہ طبع سوم ص ۹۲ تا ۲۳)

مندرجہ بالا کلام علم معرفت سے یہ امر بالکل واضح ہو گیا اور محتاج مزید وضاحت نہ رہا کہ امام

فہرست کتب ادارہ معارف اسلام (رجسٹرڈ)

مندرجہ ذیل کتابیں خود پڑھیں اور خرید کر دوسروں کو پڑھائیں۔ تمام آمدنی اشاعت مذہب پر صرف ہوتی ہے۔

ترجمہ تفسیر پارہ آئے مجلد ۲/۸ — بغیر مجلد ۲/۴

مذہب اور سائنس ۱۰/

حکومت ربانی ۸/

محرم و آداب عزا ۸/

نوائے اقبال (در مدح اہلبیت) ۸/

موازنہ حق و باطل ۶/

دلیل عزا ۶/ — قوانین شرعیہ ۵/

تعلیم کی ناکامی اور اس کا علاج ۱/

رحیپلط ٹریڈرز (انگریزی) ۴/

اقتصادی مشکلات کا حل ۴/

مہدی موعود ۴/ — عصمت انبیاء ۴/

ذکر بہلول ۲/ — اسوہ صوفیاء ۲/

آل محمد ۲/ — اسوہ ضرورت اتحاد ۲/

رحمۃ للعالمین (اسلام اور الٰہیات) ۳/

شیعہ و حدانیت

حدیقہ غم یوم عاشورہ کی تاریخ منظوم ۱۲/

نہج البلاغہ ہر سہ حصہ ۳/

(مترجم مفتی جعفر حسین صاحب)

سیپارۂ اول (علامہ علی نقی صاحب) ۱۲/

فلسفۂ اسلام (آغا محمد سلطان مرزا) ۱/۴

اسلامی سیاست کا ابتدائی مطالعہ ۱/۸

قرآن اور جغرافیائی مسائل ۸/

شیعہ پاکٹ بک مرزا احمد علی صاحب

اضافہ شدہ نیا ایڈیشن ۵/

تاریخ اصلاح ۱۰/

دلیل العرفان ۱/۴

معلم اسلام (علامہ کاظمی) ۳/

اعمال واجبیہ (" ") ۳/

جلباب (جواز پردہ) ۱/۴

مقتل الحسین عقبہ بن سمعان

(علامہ کامونپوری) ۸/

تصویر درد ۴/ — استیصال البدعۃ ۳/

ظفر المبین ۴/ — حقیقۃ الفقہ ۲/

خطبۂ عزا (علامہ مرزا احمد علی) ۲/

حضرت یوشع بن نون ۴/

اقوال حکمت اقوال امام حسین کی شرح ۵/

رموز حکمت ۳/ — منظر اتحاد ۲/

ترجمہ احقاق الحق جلد پنجم ۱/۴

اصل و اصول شیعہ (آل کاشف الغطاء) ۱/۸

اسلام و مسلمانوں کی تاریخ ۱/۸

حصۂ اول (عہد نبوی)

اسلامی معاشرہ (تعلیمات اہلبیت) ۱/۴

تحقیق حدیث انا مدینۃ العلم ۱/۱۰

اسلامی عقائد (تعلیمات اہلبیت) ۱/۴

عہد ناموں کی تعلیمات ۱/۴

(علامہ نجم الحسن کراروی)

ہدایۃ الحسینیہ ۳/

ماتم شبیر ۳/

ہلاکت ملوکیت در اطاعت حسینیت ۴/

تحفۂ زوجین ۴/

سیرۃ فاطمۃ الزہراء (آغا سلطان مرزا)

مجلد ۲/۸ — بلا جلد ۲/

البلاغ المبین حصہ اول (اضافہ شدہ)

آغا سلطان مرزا مجلد ۱۲/ — غیر مجلد ۱۰/

ادارۂ اصلاح کی کتابوں کی علیحدہ فہرست دفتر سے طلب کریں۔

(خرچ ڈاک بذمہ خریدار ہوگا)

ترسیل زر بنام مدیر اعزازی ادارہ معارف اسلام (رجسٹرڈ) دہلی بازار لاہور

خط و کتابت بنام } مہتمم دفتر ادارہ معارف اسلام (رجسٹرڈ) ۹/B کشمیر مینشن شاہ عالمی گیٹ لاہور

کتاب مستطاب

تفسیر بالرائے اور معارف القرآن

مصنفہ علامہ سید امداد حسین کاظمی و علامہ الحاج مرزا احمد علی ـــــ پد

علمائے کرام کی گراں قدر رائیں

ع　سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا　　کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

(۱) از جناب مستطاب علامہ سید مجتبیٰ حسن قبلہ کاموں پوری ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مکرمی سیکرٹری صاحب ادارہ معارف اسلام، سلام علیکم

فتنہ تفسیر بالرائے اور معارف قرآن کے مطالعہ سے بہت لطف اندوز ہوا جس طرح کسی دریا کا بند ٹوٹ جانے سے طوفانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح فتنہ تفسیر بالرائے کے ذیل میں اس قدر کثرت سے مضامین بیان ہو گئے ہیں جس سے طبیعت کے جوش و خروش کا پتہ چلتا ہے۔ اس کتاب کے لئے خود علامہ مرزا احمد علی صاحب کی تعبیر بہت موزوں ہے۔ آپ نے اپنی تحریر میں اسے جامع کشکول کہا ہے۔

فدائے قوم میجر سید محمد یحییٰ علی شاہ صاحب کے تعارف، مولانا قمر الزمان صاحب کے مقدمہ اولی اور مجاہد ملت شیخ غیاث الدین صاحب کے مقدمہ دوم سے ہی اس موضوع پر کافی روشنی پڑ گئی ہے۔ پھر اس کتاب کے مصنف مولانا سید امداد حسین صاحب نے تقریباً دو سو سال میں تفسیر بالرائے یا تحریف دین میں جو مواد پیدا ہوا ہے اس پر خوب تنقید کی ہے۔ آپ نے کتاب کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً ایٹمی دور اور مادی ترقیاں، ایٹمی دور کا مسلمان۔ عقل انسانی، اسلام دین فطرت ہے، سائنس کی بے اعتباری، فتنہ تفسیر بالرائے، چکڑالویت، آیات قرآن کی تفسیر کیلئے حدیث رسول کی ضرورت، ضرورت حدیث۔ رسول سے کیا مراد ہے۔ مسئلہ شفاعت، مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے دعوے، مسئلہ حیات و ممات مسیح، ختم نبوت، غلام احمد پرویز اور انکار حدیث، پرویز کی تفسیر بالرائے، تفسیر بالرائے کے تباہ کن نتائج، الٰہی معلمین کا علم، قرآن کا مفسر اول وغیرہ وغیرہ، ۲۹۷ صفحات تک تعارف و مقدمات اور متن کتاب پھر اس کے بعد فتنہ تفسیر بالرائے کا ضمیمہ (معارف القرآن) علامہ مرزا احمد علی صاحب کے قلم سے ہے۔ جو در خود عقل، مقام حضرت خاتم الانبیاء، اطاعت و اتباع رسول، اختلافات کے موقع پر رسول کی حیثیت، اجتہادی غلطی کی حقیقت، اعجاز قرآن وغیرہ وغیرہ حقیقۃً کتاب فتنہ تفسیر بالرائے اور ضمیمہ معارف القرآن ایک جامع کشکول کی حیثیت رکھتی ہے۔

مخلص
(علامہ سید) مجتبیٰ حسن کاموں پوری　　۵۷-۴-۳۰

(۲) از جناب مولانا مولوی سید منظور حسین صاحب قبلہ خطیب جامع حائری سادات گنج۔ لاہور

جناب محترم المقام کاظمی صاحب قبلہ دامت معالیکم　　سلام علیکم۔ آپ کی مصنفہ کتاب مستطاب "فتنہ تفسیر بالرائے" زیر مطالعہ ہے۔ اپنی طرز کی واحد کتاب اور بیحد مفید مطالب پر مشتمل ہے۔ خدا آپ کی سعی کو مشکور فرمائے۔ والسلام

الاحقر
سید منظور حسین نقوی۔ ملتان روڈ لاہور　　۵۷-۱-۲۱

نوٹ:- کتاب مذکور ... ادارہ معارف اسلام ... لاہور سے طلب کریں۔
قیمت مجلد ... بغیر ...